ناول "انواسی" کے سماجی، ثقافتی اور سیاسی تناظرات

تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اُردو)

مقالہ نگار:

عقیل حیدر

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۲۱ء

ناول "انواسی" کے سماجی، ثقافتی اور سیاسی تناظرات

تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اُردو)

مقالہ نگار

عقیل حیدر

یہ مقالہ

(ایم۔فل اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگو ئجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد

اگست ۲۰۲۱ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: ناول "انواسی" کے سماجی، ثقافتی اور سیاسی تناظرات: تجزیاتی مطالعہ

پیش کار: عقیل حیدر رجسٹریشن نمبر: MU-URD-F18-1576

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: زبان و ادب اردو

ڈاکٹر محمود الحسن _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی _____

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

بریگیڈیئر سید نادر علی _____

ڈائریکٹر جنرل

تاریخ: _____

اقرار نامہ

میں، عقیل حیدر حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر محمود الحسن کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا۔

_____

عقیل حیدر

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

اگست ۲۰۲۱ء

فہرست ابواب

مقالہ اور دفاع مقالہ کی منظوری کا فارم	iii
اقرار نامہ	iv
فہرستِ ابواب	v
Abstract	vii
اظہارِ تشکّر	viii

باب اول: موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔	تمہید	
	1۔ موضوع کا تعارف	1
	2۔ بیانِ مسئلہ	1
	3۔ مقاصدِ تحقیق	2
	4۔ تحقیقی سوالات	2
	5۔ نظری دائرہ کار	2
	6۔ تحقیقی طریقہ کار	3
	7۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	3
	8۔ تحدید	3
	9۔ پس منظری مطالعہ	3
	10۔ تحقیق کی اہمیت	4
ب۔	حفیظ خان مختصر احوال و آثار	4
ج۔	اکیسویں صدی کا ناول اور "انواسی" کی انفرادیت	18
د۔	حفیظ خان کا عہد اور مقام کا تعین	30
	حوالہ جات	34

باب دوم: ناول "انواسی" کا سماجی تناظر میں تجزیہ

الف۔ انگریزی تسلط کے بہاولپور کے سماج پر اثرات 45

ب۔ مذہبی اجارہ داری کے سماج پر اثرات 52

ج۔ ناول " انواسی" میں کرداروں کی ذہنی کشمکش کے سماج پر اثرات 58

حوالہ جات 71

باب سوم: ناول "انواسی" کا ثقافتی تناظر میں تجزیہ

الف۔ ناول "انواسی" میں بہاولپور کی ثقافت کی عکاسی 77

ب۔ ناول " انواسی" میں مجموعی ثقافت کی نوعیت اور مقامی مسائل 87

ج۔ علاقے کی حقیقی ثقافت اور ناول کا بیانہ 95

حوالہ جات 105

باب چہارم: ناول "انواسی" کا سیاسی تناظر میں تجزیہ

الف۔ ناول انواسی میں پیش کی جانے والی سیاسی صورت حال 111

ب۔ ناول " انواسی" میں سیاسی انتشار کی نوعیت اور اس کے اثرات 116

ج۔ ناول "انواسی" میں سیاسی بیانیے کی انفرادیت 128

حوالہ جات 133

ماحصل

مجموعی جائزہ 136

تحقیقی نتائج 143

سفارشات 144

کتابیات 145

Abstract

This piece of research is analytical study of writing of Hafiz Khan novel Anwasi .Anwasi is the description of waseb of the area of Adam Wahn and Bahawalpur . This novel is the narration of the culture, history and society of Bahawalpur.This thesis was aimed to review with detail to know more about the quality of subject and the novel overall. This research depicted the writer's view of history and narration of a past incident.This study has tried to analyse the different aspects of Hafiz Khan writing and it will add more literature of hafiz khan.In this research author try to elaborate the cultre of Bahawalpur and Adam Wahan by analyzing writing of Hafiz khan. This novel is detailed narration political, social and cultural aspects of Bahawalpur. Data was collected from all those books, novels, digests which are published on Muhammad Hafiz Khan. In this study researcher tried to find and help the reader to understand it's plot, characters and story. It is concluded in this study that how brutally colonial power ruined the socioeconomic and political system of a society for their vested interests. This novel is narration of historical facts actually. This thesis shows the new face of this novel and its writer views. The overall view of discussion depicts the suppression of women. At the end of this study research results, suggestions and recommendation are given.

اظہارِ تشکّر

اس مقالے کی تکمیل اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم کی بدولت ممکن ہوئی۔ شکر ہے اس پاک ذات کا جو رحمن اور رحیم ہے۔ خاص طور پہ ڈاکٹر محمود الحسن کا انتہائی ممنون ہوں۔ جنہوں نے ابتداء سے اب تک ہر موقع پر میرا ساتھ دیا، ہر مرحلے پر ان کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی میرے شاملِ حال رہی اور مجھے جس وقت بھی ان کی ضرورت محسوس ہوئی وہ میری مدد کے لیے موجود اور دستیاب رہے۔ میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ بعد ازاں شکر گذار ہوں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز اسلام آباد کے صدر شعبہء اردو ڈاکٹر فوزیہ اسلم اور دیگر اساتذہ جن میں کو آرڈینٹر ڈاکٹر صائمہ نذیر، ڈاکٹر نازیہ یونس، ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر شفیق انجم اور تمام اساتذہ کرام کا، جن کی رہنمائی اور شفقت ہر لمحہ مجھے میسر رہی۔ میں شکر گزار ہوں جناب محمد حفیظ خان کا انہوں نے تعاون اور رہنمائی عطا فرمائی اور معلومات عطا کیں۔ ان کے ساتھ ان کے حالاتِ زندگی اور ناول کے فن و فکر پر سیر حاصل گفتگو رہی۔ اس گفت و شنید کے نتیجے میں ان کے ناول کے موضوعات اور ان کی تحریر کے اسلوب کو جاننے کا موقع ملا۔ میں پی ایچ ڈی اسکالر سدرہ طاہر کا شکر گزار ہوں کہ جن کی مخلصانہ ہمدردی اور علم دوستی کے سبب مجھے قدم قدم پہ راہنمائی ملی۔ انہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود میری ہر طرح سے علمی و ادبی مدد کی۔ دُعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے علم میں مزید برکت عطا فرمائے آمین۔ تمام دوست احباب کا شکر گزار ہوں جنہوں نے قیمتی مشوروں سے نوازا۔

اس سلسلے میں اپنے بھائی اکبر کا خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، ان کی معاونت اور والدین کی پُر خلوص دعائیں ان تمام مراحل میں میرے ساتھ رہیں جن کی صحت و سلامتی کے لیے دعا گو ہوں۔ اس کے بعد سب سے زیادہ شکریے کے مستحق میرے بڑے بھائی سرپرست ضمیر علی ہیں انھوں نے تعلیم کے تمام اخراجات کے علاوہ تعلیم کے لیے ایک اچھا ماحول بھی فراہم کیا۔ ان کی بے انتہا قربانیوں اور دن رات کی محنت نے مجھے آج اس مقام تک پہنچایا۔

عقیل حیدر

اسکالر ایم فل اردو

باب اول

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف: تمہید

i۔ موضوع کا تعارف

حفیظ خان موجودہ دور کے ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ہے۔ اپنے منفرد اسلوب اور کہانی کی بُنت کے حوالے سے اپنی پہچان آپ ہیں اور اسی بنا پر انہوں نے بہت جلد اردو دنیا میں شہرت حاصل کی۔ شروع میں انھوں نے سرائیکی زبان میں لکھنا شروع کیا اور "کچ دیاں ماڑیاں" ڈراموں کی پہلی کتاب لکھی افسانوی مجموعوں میں "ویندی رُت دی شام" کے نام سے لکھا۔ اور اردو افسانے میں "یہ جو عورت ہے" کے عنوان سے لکھا۔ اس کے علاوہ سرائیکی ڈرامے بھی لکھے۔ "ادھ ادھورے لوگ" ان کا سرائیکی ناول ہے جس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کالم اور تحقیق و تنقید کے حوالے سے بھی بہت کچھ لکھا۔

یہ مقالہ حفیظ خان کے اردو ناول "انواسی" کے سماجی، ثقافتی اور سیاسی تناظرات کے تجزیاتی مطالعے پر مشتمل ہے۔ اس ناول میں کئی موضوعات ایسے ہیں جو توجہ کے لائق ہیں مثلاً طاقتوں اور مناصب کا بے جا استعمال، مذہبی منافرت، مشرق اور مغرب یا ان کے نمائندوں میں یکسانیت کے پہلو، مقاصد کی تکمیل کی خواہشات کی حسرت میں تبدیلی، سیاست اور بغاوت، محبت اور نفرت، توہم پرستی، کینہ، بغض، عداوت، انتقام اور اس کے علاوہ اور بہت کچھ لیکن ان تمام موضوعات کے بیان میں جو امر سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ سماجی ، ثقافتی اور سیاسی تناظرات ہیں۔

ii۔ بیانِ مسئلہ

حفیظ خان نے ناول نگاری اور افسانہ نگاری میں اپنی منفرد پہچان بنائی۔ ان کا ناول "انواسی" کئی لحاظ سے ایک انوکھا ناول ہے۔ اس میں سرائیکی وسیب کی ثقافت اور اردو ناول کی روایت پہلو بہ پہلو چلتے نظر آتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ اس میں عمومی تاریخی بیانیوں سے ہٹ کر انیسویں صدی کے ایک دور افتادہ علاقے

اور متعلقہ سماج کی عکاسی کی گئی ہے۔ ضروری تھا کہ "انواسی" کا سماجی، ثقافتی اور سیاسی تناظرات کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تا کہ ان پہلوؤں تک رسائی حاصل ہو جو معاشرے کے عمومی مہابیانیوں سے مختلف ہیں۔

iii۔ مقاصدِ تحقیق

مجوزہ تحقیقی مقالے کے مقاصد درج ذیل ہیں:۔

ا۔ناول "انواسی" کے سماجی لوازمات کا جائزہ لینا۔

۲۔ "انواسی" کے ذریعے انگریزی تسلط کے بہاولپور کی مقامی سیاست پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لینا۔

۳۔اردو ناول میں "انواسی" کے مقام کا تعین کرنا۔

iv۔ تحقیقی سوالات

ناول "انواسی" کا تجزیاتی مطالعہ کے لیے درج ذیل تحقیقی سوالات سامنے رکھے گے۔

ا۔ناول "انواسی" کی سماجی انفرادیت کیا ہے؟

۲۔ "انواسی" کے کردار کس نوعیت کے ہیں؟ وہ اپنے طبقات کی کس حد تک ترجمانی کرتے ہیں؟

۳۔ناول "انواسی" کی سیاسی انفرادیت کیا ہے؟

v۔ نظری دائرہ کار

پیشِ نظر موضوع تحقیق ناول "انواسی" کا سماجی، ثقافتی اور سیاسی تناظرات کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔ مجوزہ تحقیق کے نظری دائرہ کار کے سلسلے میں دو کتب پیشِ نظر رہیں۔ایک سید زاہد علی کی کتاب "بہاولپور کی سرزمین" اور دوسری ڈاکٹر مبارک علی کی کتاب "جاگیر داری اور جاگیر دارانہ کلچر" ان دونوں ناقدین نے ادب کی معنویت زندگی اور سماج کے تناظرات میں طے کی ہے۔حفیظ خان کے ناول "انواسی" کا سماجی، ثقافتی اور سیاسی تناظرات کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے ان مباحث کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔اس طرزِ تحقیق میں اس شخصیت کے حالاتِ زندگی اور تمام ادبی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ناول کا موضوع بہاولپور کے ایک دور دراز علاقے کی ثقافت، سماج اور سیاست کی عکاسی کرتا ہے اس لیے سماج، ثقافت اور سیاست کے بیانیے کو سامنے رکھتے ہوئے "انواسی" کا سماجی، ثقافتی اور سیاسی تناظرات کی روشنی میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ تحقیق میں ناول "انواسی" کے سماجی، ثقافتی اور سیاسی تناظرات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

vi۔ تحقیقی طریقہ کار

تحقیق کا موضوع "محمد حفیظ خان کے ناول "انواسی کے سماجی، ثقافتی اور سیاسی تناظرات کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔ ان کی ادبی خدمات کے متعلق متعدد ناقدین نے اظہارِ خیال کیا ہے۔لہذا موضوع سے متعلق مطبوعات کی جمع آوری، ترتیب اور مطالعہ و تجزیہ کیا گیاہے۔اس تحقیق میں تجزیاتی اور مشاہداتی طریقہ کار کو بروئے کار لایا گیاہے۔بنیادی ماخذات میں محمد حفیظ خان کے ناول "انواسی" جبکہ ثانوی ماخذات کے طور پر محمد حفیظ خان کے فن پر چھپنے والے مختلف مضامین، کتب اور رسائل کا مطالعہ کیا گیا۔ثانوی ماخذات تک رسائی کے لیے مختلف لائبریریوں سے رجوع کے ساتھ ساتھ انٹرنیٹ اور دیگر ماخذات سے بھی استفادہ کیا گیا۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق

حفیظ خان کی اردو ادب میں خدمات کے موضوع پر گونمنٹ کالج یونی ورسٹی فیصل آباد سے ایک تحقیقی مقالہ لکھا جاچکاہے۔ان کے اردو ناول "ادھ ادھورے لوگ" پر بہاؤالدین زکریا یونی ورسٹی کے ایم اے کے طالب علم آصف رضا نے مقالہ تحریر کیا ہے۔ان کے دیگر ناولوں بالخصوص ان کے ناول "انواسی" پر سماجی، ثقافتی اور سیاسی تناظرات کے تجزیاتی مطالعہ سے کوئی مقالہ تحریر نہیں کیا گیا۔

viii۔ تحدید

مجوزہ تحقیق کا موضوع محمد حفیظ خان کے ناول "انواسی" کے سماجی، ثقافتی اور سیاسی تناظرات کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔اس کے علاوہ ان کی دیگر تحریریں مقالہ کی تحقیقی حدود سے باہر ہیں۔

ix۔ پس منظری مطالعہ

پس منظری مطالعہ کے طور پر ناول نگاری کے مطالعے پر مبنی کتب اور مضامین کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔خاص طور پر جن کتب میں حفیظ خان اور ان کے معاصرین کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ان کے فن پر لکھے گئے مضامین کے ساتھ ساتھ مختلف تنقیدی کتب کو بھی پیش نظر رکھا گیا۔اس کے علاوہ مختلف ناقدین کی آراء، تبصروں اور تجزیوں کو بھی شاملِ تحقیق کیا گیاہے۔

x۔ تحقیق کی اہمیت

حفیظ خان اردو ناول نگاری میں نمایاں لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ان کی ادبی خدمات پر متعدد ناقدین اپنے آراء کا اظہار کر چکے ہیں۔ان کے افسانوی مجموعوں پر ایم اے کی سطح کا ایک مقالہ تحریر کیا جا چکا ہے جو کہ تعارفی سطح کا ہے۔اس کے علاوہ ان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے کئی مضامین بھی چھپ چکے ہیں۔ حفیظ خان کا شمار آج کے اچھے لکھنے والوں میں ہوتا ہے اور ان کے کام کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ وہ سرائیکی وسیب کی نمائندگی کرتے ہیں۔انھوں نے سرائیکی زبان میں بہت سی خدمات سرانجام دیں انھوں نے سرائیکی زبان میں ناول،افسانے اور کالم لکھ کر اپنی الگ پہچان بنائی۔ خصوصیت کے ساتھ اپنے ناولوں کے ذریعے انھوں نے اس علاقے کی تاریخ کو زبان عطا کی۔اس تحقیق سے حفیظ خان کی ان جہات کو سمجھنے اور پرکھنے میں مدد ملے گی۔

ب۔ حفیظ خان مختصر احوال و آثار

محمد حفیظ خان معروف محقق،مورخ،افسانہ نگار،ناول نگار،ڈرامہ نگار اور کالم نویس کے طور پر اردو ادب میں اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ایک لمبے عرصے سے علم و ادب کی کئی اصناف میں اپنی عمدہ تحریروں سے ایک عالم سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں۔ عملی زندگی کا آغاز وکالت سے کیا،بعد ازاں ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہوئے۔جامعاتی سطح پر قانون کے استاد بھی رہے۔وفاقی اور صوبائی سول سروس کا حصہ رہے۔بعد ازاں عدلیہ میں شمولیت اختیار کی اور ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے منصب پر فائز رہے۔ان دنوں وفاقی جوڈیشل اکیڈمی اسلام آباد میں تدریسی اور انتظامی امور کے نگران ہیں۔اردو اور سرائیکی میں کمال مہارت سے لکھتے ہیں۔شاعری سے بھی شغف ہے۔۳۰ سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ قومی سول ایوارڈ "تمغہ امتیاز" بھی حاصل کر چکے ہیں۔۱۳ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو ڈیرہ نواب صاحب (بہاول پور) میں پیدا ہونے والے اس صاحبِ طرز ادیب کی کامیابیوں کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ تخلیقی ادب سے برس ہا برس کی عملی وابستگی نے ان کی تحریروں میں نکھار پیدا کیا ہے اور قارئین ان کی نئی کتابوں کے منتظر رہتے ہیں۔ ایک انٹرویو میں جاوید اختر بھٹی نے حفیظ خان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کیا:

"حفیظ خان سے میری دوستی تیس سال پرانی ہے ان کے والد میرے والد کے دوست تھے یوں ان کے خاندان سے تعلق کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ نصف صدی کا قصہ ہے۔ حفیظ خان ایک ہمدرد انسان ہیں وہ اپنے دوستوں کے بارے میں سوچتے ہیں ،ان کا خیال رکھتے ہیں ان کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ وہ مختلف شہروں میں سول جج اور پھر سیشن جج کے فرائض انجام دیتے رہے ہر جگہ انہوں نے ادیبوں اور دانشوروں کو خود تلاش کیا۔ انہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود تصنیف و تالیف کا کام جاری رکھا۔"(۱)

اپنی بااخلاق فطرت کے سبب حفیظ خان ایک وسیع حلقہ احباب رکھتے ہیں اور ان کے تمام دوست ان کی ہمدرد اور پُر خلوص دوستی سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ حفیظ خان ایک درد مند دل اور حساس طبیعت رکھنے والے انسان ہیں جو کسی جانور کو بھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحاریر بھی اس تاثر سے خالی نہیں خصوصاً ان کے کالموں میں اس کی اکثر مثالیں ملتی ہیں حفیظ خان ظاہر و باطن میں ایک مکمل اور بہترین شخصیت کے مالک ہیں۔

حفیظ خان کا تعلق منج راجپوت خاندان سے ہے اور ان کے آباؤاجداد ضلع ہوشیار پور کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۹۰ء میں یہ بہاول پور آگئے اور پھر یہیں مقیم ہوگئے ان کے آباؤاجداد عرصہ دراز تک نواب آف بہاول پور کی فوج میں مختلف عہدوں پر فائز رہے البتہ حفیظ خان کے دادا عبدالعزیز خان نے آرمی میں ملازمت نہیں کی اور اپنی زمینوں پر توجہ دی حفیظ خان کے والد کا نام رائے امان اللہ تھا اور وہ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے ان کی ایک بہن تھی جب امان اللہ گیارہویں جماعت میں تھے تو ان کے والد وفات پاگئے۔ لہٰذا طالب علمی کے زمانے سے ہی ان کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا تمام تر ذمہ داریاں ان کے سر پر آن پڑیں امان اللہ بارُعب، ملنسار، وجیہہ شخصیت کے مالک اور نہایت علم دوست انسان تھے اور یہی چیز حفیظ خان میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ امان اللہ ایس ای کالج بہاول پور میں احمد ندیم قاسمی کے کلاس فیلو رہے تعلیم مکمل کرنے کے بعد نواب آف بہاول پور کی آرمی میں سیکنڈ لیفٹیننٹ کا کمیشن ملا تو انہوں نے فوج کی ملازمت اختیار کرلی لیکن امان اللہ کی والدہ اپنے اکلوتے بیٹے کو فوج میں بھیجنے پر رضامند نہ تھیں لہٰذا انہیں میڈیکل اَن فٹ قرار دلوا کے

ملازمت سے برخواست کروا دیا۔اس کے بعد محکمہ پولیس میں اے ایس آئی بھرتی ہوگئے اور بعد میں یہ ملازمت بھی چھوڑ دی۔ اور پھر کچھ عرصہ بعد محکمہ ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن میں انسپکٹر ہوگئے جو بعد ازاں ترقی پاکر ڈائریکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ امان اللہ نے چار شادیاں کیں جن میں سے پہلی شادی ان کے ماموں غلام محمد خان جو کہ نواب آف بہاول پور کے مہتمم کی جاگیرات بھی تھے ان کی بیٹی غلام سکینہ سے ہوئی جن سے دو بیٹیاں ہیں جبکہ دوسری اور تیسری بیوی سے ان کو کوئی اولاد نہ ہوئی چوتھی شادی جو کہ شمیم اختر سے ہوئی ان کے بطن سے حفیظ خان پیدا ہوئے جو ان کے پہلے بیٹے تھے حفیظ خان کے بعد دو بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔یوں حفیظ خان سمیت تین بھائی اور تین بہنیں ہیں جن میں سے حفیظ خان کا دوسرا نمبر ہے۔[۲]

حفیظ خان ۱۳اکتوبر ۱۹۵۶ء کو ڈیرہ نواب صاب احمد پور شرقیہ ضلع بہاولپور میں پیدا ہوئے۔اپنے آبائی شہر احمد پور شرقیہ کے بارے میں حفیظ خان کہتے ہیں کہ:"میں اسے سرائیکی وسیب کا لکھنؤ سمجھتا ہوں"[۳]حفیظ خان کا مکمل اور اصل نام" محمد حفیظ اللہ خان" ہے۔ تاہم ان کا مشہورِعام اور علمی و ادبی نام "حفیظ خان" ہے حفیظ خان نے کچھ عرصہ "احمد میزان" کے نام سے بھی لکھا مگر ان کی پہچان ادبی حلقوں میں "حفیظ خان" کے نام سے ہے۔روزنامہ "خبریں" میں ان کا کالم اسی نام سے "سرکشی" کے عنوان سے شائع ہوتا ہے۔

تعلیم:

اگر ہم حفیظ خان کے شاندار تعلیمی کیریئر کا جائزہ لیں تو ان کا تعلیمی سفر پرائمری اور مڈل کے بعد ۷۰ کی دہائی سے شروع ہوتا ہے۔انہوں نے ۱۹۷۰ء میں صادق علی ہائی سکول احمد پور شرقیہ سے میٹرک کیا۔ ۱۹۷۳ء میں ایف ایس سی پری میڈیکل اور ۱۹۷۵ء میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور سے بی ایس سی (میڈیکل گروپ) پاس کیا۔۱۹۷۷ء کے سیشن میں جس کا رزلٹ ۱۹۷۹ء میں آیا، انہوں نے بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے ایل ایل بی کیا۔ حفیظ خان ایل ایل بی کے امتحان میں نمایاں پوزیشن کے ساتھ کامیاب ہوئے۔جب ایل ایل بی کا رزلٹ آیا تو پتہ چلا کہ ڈپٹی کمشنر ملتان مہر جیون خان اول آئے اور حفیظ خان دوم لیکن چونکہ مہر جیون خان پرائیویٹ امیدوار تھے اس لیے حفیظ خان بطور ریگولر سٹوڈنٹ اول قرار پائے۔۱۹۷۸ء میں انہوں نے بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ملتان ہی سے تاریخ میں ایم اے بھی کیا۔۱۹۸۰ء، ۱۹۸۴ءاور ۱۹۸۵ء میں مقابلے کے مختلف امتحانات بھی پاس کیے اور بعد ازاں ۲۰۱۳ء میں سپیریئر یونیورسٹی لاہور سے ایل ایل ایم کی ڈگری حاصل کی۔ شاندار تعلیمی سلسلہ جاری رکھتے ہوئے حفیظ خان نے مقابلے کے امتحانات میں بھی حصہ لیا اور خوش قسمتی سے کامیاب بھی ہوئے۔

۱۔ ۱۹۸۰ء میں ریڈیو پاکستان کی جانب سے منعقدہ پروگرام پروڈیوسر کی ریکروٹمنٹ کے مقابلے کا امتحان پاس کیا۔

۲۔ دوسرا امتحان پی سی ایس (جوڈیشل) سول جج کے لیے ۱۹۸۴ء میں پاس کیا۔

۳۔ ۱۹۸۴ء میں ہی انہوں نے پی سی ایس ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن یعنی پی سی ایس ایگزیکٹیو پاس کیا۔

۴۔ ۱۹۸۴ء میں سی ایس ایس کیا اور انہیں بارہویں کامن کورس میں پہلے پوسٹل اور بعد میں آڈٹ اکاؤنٹس گروپ ملا۔

۵۔ ۱۹۸۵ء میں دوبارہ پی سی ایس (جوڈیشل) پاس کیا اور ایک بار پھر عدلیہ میں چلے گئے۔[۴]

ملازمت وروزگار

حفیظ خان کی زندگی میں ۷۰ کی دہائی کے پہلے پانچ سال ملازمت کے حوالے سے نہایت اہمیت کے حامل ہیں انہوں نے وکالت کا آغاز جنوری ۱۹۸۰ء میں کیا۔ وکالت کا عرصہ جنوری ۱۹۸۰ء سے فروری ۱۹۸۱ء تک محیط ہے۔ اس دوران انہوں نے ریڈیو پاکستان میں پروگرام پروڈیوسر ریکروٹمنٹ کے لئے مقابلے کے امتحان میں اپلائی کیا جس کا تحریری امتحان دسمبر ۱۹۸۰ء میں اور زبانی امتحان جنوری ۱۹۸۱ء میں ہوا۔ مارچ ۱۹۸۱ء میں سٹاف ٹریننگ اکیڈمی جوائن کی۔ یہ ٹریننگ ۳۰ جون ۱۹۸۱ء تک جاری رہی جس میں حفیظ خان اول آئے اول آنے کی وجہ سے انہیں ان کی مرضی کا حق دیا گیا اور انہوں نے ریڈیو پاکستان ملتان کا انتخاب کیا گیا۔ لہٰذا انہوں نے یکم جولائی ۱۹۸۱ء کو ریڈیو پاکستان بطور پروگرام پروڈیوسر جوائن کیا۔ ۱۵ جولائی ۱۹۸۲ء تک یہاں فرائض سر انجام دیتے رہے۔ ریڈیو پروڈیوسر بننے سے پہلے وکالت کے دوران انہوں نے PCS (جوڈیشل) میں بھی اپلائی کیا تھا لیکن امتحان کی تاریخ مقرر ہونے سے قبل ہی حفیظ خان پروڈیوسر تعینات ہو گئے۔ آخر اس دوران دسمبر ۱۹۸۱ء میں امتحان کی تاریخ کا اعلان ہو گیا اور ان کو رول نمبر بھی جاری ہو گیا۔ وہ امتحان کے لیے جانا نہیں چاہ رہے تھے لیکن ان کے ایک وکیل دوست ملک سعید نے کہا کہ کوئی بات نہیں آپ امتحان دیں۔ حفیظ خان کو چونکہ ایک ڈیڑھ سال کا عرصہ ہو چکا تھا وکالت چھوڑے ہوئے تو وہ ذہنی طور پر اس امتحان کے لیے تیار نہ تھے مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ انہوں نے امتحان دیا جو کہ چار دن میں اختتام پذیر ہوا۔ چوں کہ اس کے آٹھ پیپر ہوتے تھے دو پیپر روزانہ صبح شام ہوتے تھے۔ یہ PCS جوڈیشل کا ان کا پہلا امتحان تھا جو انہوں نے پاس کیا۔ ۱۵ جولائی ۱۹۸۲ء کو انہوں نے ریڈیو کو خیر آباد کہہ دیا۔ ۱۶ جولائی ۱۹۸۲ء کو جمعۃ المبارک کی چھٹی تھی تو ۱۷ جولائی ۱۹۸۲ء کو رحیم یار خان میں بطور سول جج تعینات ہوئے۔ یہاں

پر انہوں نے نومبر ۱۹۸۳ء میں استعفٰی دے دیا۔ استعفٰی دینے کی وجہ کے متعلق انہوں نے بتایا کہ ایک تو وہ ایڈہاک جاب تھی، دوسرا یہ کہ جوڈیشری کے ماحول سے غیر مطمئن ہوئے۔ یہاں سے چھوڑنے کے بعد فوراًبعد اسلامیہ یونی یورسٹی بہاول پور میں انہیں نہایت محبت و وقار کے ساتھ بطور لیکچرار شعبہ قانون پیش کش کی گئی۔ چوں کہ لاء میں ان کی فرسٹ کلاس میں کامیابی تھی اور سیٹ بھی خالی تھی تو وہاں انہوں نے جنوری ۱۹۸۴ء میں بطور لیکچرار جوائن کر لیا۔

انہیں یونیورسٹی میں خوش آمدید کہا گیا کہ ہمارے لئے اعزاز اور مسرت کا مقام ہے کہ ایک سابق جج ہمارے ہاں مدرس بنے ہیں۔ یونیورسٹی نے دو اضافی ترقیاں (Advance Increments) کے ساتھ پیش کش بھی کی کہ پی ایچ ڈی کے لیے انگلینڈ کی سکالرشپ بھی آئی ہوئی ہیں کہ اگر آپ پی ایچ ڈی کے لئے انگلینڈ جانا چاہتے ہیں تو جا سکتے ہیں۔ اس پر حفیظ خان نے کہا کہ میں نے ابھی جو مقابلے کے امتحانات دیئے ہوئے ہیں ان کے رزلٹ آجائیں تو پھر میں فیصلہ کر سکوں گا کہ انگلینڈ سکالرشپ جاؤں یا نہ جاؤں۔ اس دوران حفیظ خان نے پی سی ایس ایگزیکٹو، سی ایس ایس اور دوسری بار پی سی ایس جوڈیشنل کے امتحانات دیئے جن کے نتائج آگے پیچھے آئے اور وہ سب میں کامیاب رہے۔ بطور لیکچرار انہوں نے جنوری ۱۹۸۴ء تا ستمبر ۱۹۸۴ء تک اپنے فرائض سر انجام دیئے۔ اس دوران دیے گئے پی سی ایس ایگزیکٹو میں کامیاب ہوئے اور ستمبر ۱۹۸۴ء سے فروری ۱۹۸۵ء تک ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن آفیسر لاہور رہے۔ ۱۹۸۴ء میں ہی یعنی اسی سال سی ایس ایس کرنے کے بعد بارہویں کامن کورس میں آڈٹ اینڈ اکاونٹس گروپ میں ملازمت کی پیشکش ہوئی تھی مگر انہوں نے یہ ملازمت نہ کی اور آخر پی سی ایس جوڈیشل کے امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد سول جج مقرر ہو گئے اور یوں عدلیہ کو اپنالیا اور آج بھی اس سے وابستہ ہیں۔

۷۰ کی دہائی میں ریڈیو تفریح کے ذرائع میں خاص اہمیت کا حامل رہا۔ ان دنوں ریڈیو ایک دبستان کی سی حیثیت رکھتا تھا جو اپنے سامعین کو تفریح کے ساتھ ساتھ ایک خاص اندازِ ترتیب بھی فراہم کرتا تھا۔ ریڈیو کے سامعین اس سے بہت کچھ سیکھتے تھے اس کے ذریعے عالمی معلومات کے ساتھ تخلیقی پہلوؤں کو بھی نمو ملتی تھی اور وہ ایک سامع حفیظ خان کی طرح ایک تخلیق کار بن پاتا تھا۔ حفیظ خان کو ریڈیو سے بہت دل چسپی تھی سب سے پہلے تو وہ ایک سامع تھے۔ بطور سامع ریڈیو سے ان کا تعلق ۱۹۷۰ء سے ہی بن گیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ۱۹۷۳ء میں پروگرام "سرودِ سحر" بہت مقبول ہوا کرتا تھا جس کے پروڈیوسر سید قمر حسین تھے۔ یہ پروگرام ریڈیو پاکستان ملتان سے نشر ہوتا تھا حفیظ خان نے اس پروگرام میں خط لکھنے سے ریڈیو سے وابستگی کا

آغاز کیا جو ان کا ریڈیو پاکستان کا باقاعدہ عملی طور پر حصہ بننے پر منتج ہوا۔ اس پروگرام میں سامعین کے بہترین خطوط کو شامل کیا جاتا۔ حفیظ خان کے خطوط کو بہترین قرار دیا جاتا اس سے ان کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس دوران حفیظ خان کئی بار پروڈیوسر سید قمر حسین سے ملے بھی لہٰذا ان کے دل میں بھی ریڈیو پہ بولنے میں دل چسپی پیدا ہوئی۔ ان دنوں ملتان ریڈیو پہ ڈرامے کی صداکاری کے لیے آڈیشن میں حصہ لیا لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ آخر ریڈیو پاکستان بہاول پور جس کا آغاز ہی ہوا تھا اور اسپورٹس ہیڈ کوارٹر کی عمارت کو ریڈیو پاکستان بہاول پور میں تبدیل کیا جارہا تھا حفیظ خان اس کا حصہ بنے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حفیظ خان کو ریڈیو سے بھی لگاؤ تھا اور وہ اس میں اپنی پہچان رکھتے تھے جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ گنتی کے لوگوں میں شمار ہوتے تھے بقول حفیظ خان:

> "ریڈیو پاکستان بہاول پور کے پروگراموں میں صداکاری سے میرے نہ صرف ریڈیو پر بولنے کے شوق کی تسکین ہوئی بلکہ میں نے بہت کچھ لکھا۔ یوں کہہ لیں کہ میرے سیکھنے کا عمل بھی شروع ہو گیا۔ میرے خیالات کو بُنت بھی ملنے لگی اور میرے فکر کو بھی تقویت حاصل ہونے لگی اور میں نے ریڈیو کے لیے لکھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ مجھے ریڈیو پاکستان بہاولپور کے پہلے رائٹر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ یہاں پہ میں نے اکرم شاد اور سلطان المعظم جیسے ساتھیوں سے بہت کچھ سیکھا اور شروع میں انہوں نے میری بہت رہنمائی کی"(۵)

حفیظ خان نے ریڈیو صداکاری سے قبل لکھنے کا آغاز کر دیا تھا۔ لیکن ریڈیو کی دنیا میں انہیں ایسے راستے میسر آئے جو جانب منزل رواں دواں تھے۔ اپنی گفتگو کے دوران انہوں نے بتایا کہ وہ ریڈیو پاکستان بہاول پور کے پہلے ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ انہوں نے ۱۹۷۵ء میں بچوں کے سرائیکی پروگرام کے لئے سب سے پہلا ڈرامہ "سنہری گلاب" لکھا۔ ریڈیو بہاول پور کے معروف ڈرامے " آبگینے " اور "زرد چاندنی" حفیظ خان کی ہی تخلیق ہیں۔ مزید یہ کہ یہاں انہوں نے سرائیکی پروگرام اناؤنسمنٹ اور فیچر میں بھی حصہ لیا اور ڈسک جوکی پروگرام فارم فورم اور بچوں کے پروگرام "لشکارا" کے لئے بھی بہت زیادہ فیچرز لکھے۔ ریڈیو بہاول پور کے ہی سرائیکی ادبی پروگرام "پھوار" کے لیے افسانہ لکھا جس کا نام تھا "ہیرے تے ککرے"۔ ریڈیو بہاولپور میں ڈرامے اور فیچرز لکھنے کے ساتھ ساتھ خواتین اور بچوں کے پروگرامز کے لئے اور زرعی پروگرام" جمہوری آواز" کے لئے سکرپٹ بھی لکھے۔ حفیظ اللہ خان نمبر ۱۹۷۶ء تک ریڈیو بہاول پور سے وابستہ رہے۔

ریڈیو ملتان میں حفیظ خان نے دو حیثیتوں سے کام کیا۔ ایک بطور پروگرام اناؤنسر اور دوسرا پروگرام پروڈیوسر علاوہ ازیں وہ ایک ڈرامہ نگار اور سکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے بھی نمایاں رہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بتایا کہ فروری ۱۹۷۷ء میں سرائیکی اناؤنسر کے طور پر ریڈیو پاکستان ملتان سے ان کے کیریئر کا آغاز ہوا۔ قبل ازیں وہ نومبر ۱۹۷۶ء تک ریڈیو بہاول پور سے وابستہ رہے۔ ملتان ریڈیو انہوں نے صداکاری سے آغاز کیا ویسے تو بطور سامع پروگرام "سرودِ سحر" میں بھی خط لکھا کرتے تھے۔ صداکاری کے ساتھ ساتھ سرائیکی ڈرامے بھی لکھے اور یہاں اُن کی ملاقات اس وقت کے مشہور پروڈیوسر ملک عزیز الرحمٰن، فخر بلوچ، اور نذیر بلوچ سے ہوئی جن کے تعاون اور خصوصی رہنمائی سے ان کی صلاحیتوں کو نکھرنے کا موقع ملا۔ ملتان ریڈیو میں بھی ان کے ڈرامہ اور فیچرز لکھنے کی سرگرمیاں جاری رہیں بلکہ ان کی پہچان بنیں۔ یہاں پر انہوں نے زیادہ تر سرائیکی پروگراموں کے لیے لکھا۔

جیسا کہ ملازمت کے زیرِ عنوان ذکر ہو چکا ہے کہ حفیظ خان ریڈیو پاکستان کی جانب سے منعقدہ پروڈیوسر کے مقابلہ کے امتحان میں نمایاں پوزیشن سے کامیاب ہوئے اور بعد میں سٹاف ٹریننگ میں بھی اول رہے تو اس پر انہیں اپنی مرضی کا اسٹیشن چننے کا اختیار دیا گیا۔ لہٰذا انہیں ان کی پسند کے مطابق ریڈیو پاکستان ملتان تعینات کیا کر دیا گیا ریڈیو ملتان کو بطور پروڈیوسر انہوں نے یکم جولائی ۱۹۸۲ء کو جوائن کیا۔ اس دور میں ان کے ساتھی صداکاروں میں قیصری نقوی، سہیل اصغر، خالد ملک، سلیم اختر، روبینہ ناز، تسنیم بھٹی، عمارا نسیم، خالدہ نسیم، تسنیم انصاری، عفت ذکی، زاہد خان، زاہدہ صدیق، یاسمین خان، یاسمین غلتزئی، مرحوم انور جٹ، سعید احمد، شاہد سلیم، شاہد رفیق نہایت معروف تھے جنہوں نے ان کے تحریر کردہ ڈراموں میں صوتی آہنگ شامل کیا۔ یہاں پر حفیظ خان نے ایک اور دلچسپ بات کا ذکر کیا انہوں نے کہا کہ:

> "میں ریڈیو پاکستان کا مصروف ترین پروڈیوسر رہا جو صبح سات بجے آکر رات گئے تک مختلف کاموں میں مصروف رہتا۔ سرائیکی Disk Joky پروگرام ریڈیو "کرن سویر" کے مسودے سے فراغت کے بعد پروگرام میٹنگ اور میٹنگ کے بعد کچھ ہوش نہیں رہتا۔ سرائیکی ڈرامہ، میوزک، بچوں کا پروگرام، خواتین کا پروگرام "عورتاں دی محفل" سرائیکی تقاریر اہم ایام کے حوالے سے ریڈیو سیمینار اور مذاکرے، ادبی پروگرام، جمہور دی آواز کی پروڈکشن اور کمپیئرنگ پروگرام "جواں ہر دم رواں" مذہبی پروگرام اور خصوصی اسائنمنٹ سبھی کچھ میرے ذمہ رہا۔ تعلیمِ بالغاں کا

پروگرام "ہرایک پڑھائے ایک" عوامی مسائل کا پروگرام "چلتا پھرتا مائیکروفون" میرے ہاتھوں شروع ہوئے "(۶)

ریڈیو پاکستان پر بطور پروڈیوسر حفیظ خان تقریباً ایک سال تک اپنے فرائض سرانجام دیتے رہے جسے خیر باد کہنے کے بعد وہ عدلیہ میں چلے گئے۔ روزنامہ "خبریں" ملتان کے رازش لیاقت پوری کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے ریڈیو چھوڑنے کی مندرجہ ذیل وجوہات بیان کیں:

" ریڈیو سے میں عملی طور پر جون ۱۹۷۵ء سے جولائی ۱۹۷۶ء تک مختلف حیثیتوں میں وابستہ رہا۔ میرے ادبی تشخص کی ابتدا سے نہ سہی مگر اس کیار تقائی منازل ریڈیو ہی کی مرہون منت ہیں۔ اس طرح میری شخصی تشکیل میں ریڈیو کے تلخ اور خوشگوار تجربات دونوں کا حصہ رہا ہے۔ میں ریڈیو کے شاندار ماضی کے آخری دنوں اور اس کی بحیثیت ایک ادارہ کی بربادی کے آغاز کا بھی عینی شاہد ہوں۔ "(۷)

حفیظ خان نے ریڈیو کو خیر باد کہہ دیا اور یوں یہ دور ختم بھی ہو گیا لیکن ریڈیو کا حفیظ خان کی زندگی کا ایک یادگار دور رہا ہے جس نے اپنے اَن مِٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ اس دوران انھوں نے تخلیقی کام بہت زیادہ اور نہایت تیزی سے کیا یا ان سے کروایا گیا کیوں کہ ڈرامہ ان سے لکھوایا گیا۔ اس دوران انہوں نے لاتعداد ڈرامے لکھے، فیچر لکھے اور پروگرامز کے سکرپٹ لکھے۔ ریڈیو بذاتِ خود ایک تخلیقی ادارہ ہے اور حفیظ خان کے فن کو یہاں نکھرنے اور پنپنے کا خوب موقع ملا۔ لہٰذا یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ ریڈیو میں حفیظ کا دور ایک کامیاب دور ہو رہا ہے۔ حفیظ خان لکھنے لکھانے کے ساتھ ساتھ میگزینز کی ادارت کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ یہاں بھی ان کی اعزازی حیثیت برقرار رہی۔ حفیظ خان نے ایک انٹرویو میں اس بیان کی تفصیل کچھ یوں بیان کی ہے۔ ۷۸۔۱۹۷۷ء میں یونی ورسٹی لاء کالج ملتان کی جانب سے شائع ہونے والے میگزین "العدل" کے ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۹۳ء میں جنوبی پنجاب سے نکالے جانے والے پہلے اخبار کا "The Compititor" کے ایڈیٹوریل بورڈ کے اعزازی ممبر تھے۔ یہ کرنٹ افیئر میگزین تھا اور اس میں انہوں نے سو سے زائد ایشوز کو ایڈٹ کیا۔ ادارت کے ساتھ ساتھ حفیظ خان کالم بھی لکھتے رہے، یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ کالم نگاری کے حوالے سے گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۹ء تک روزنامہ " امروز" میں طلباء کے صفحے پر مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت کالم لکھے:

۱-ایس ای کالج کے روزوشب

۲-یہ لاء کالج ملتان ہے

قومی اخبار، امروز، جسارت اور نوائے وقت میں سوشل ایشوز، کنٹری بیوٹڈ سروے رپورٹس اور کرنٹ افیئرز پہ لکھتے رہے جنوری ۲۰۰۲ء میں روزنامہ "نوائے وقت" میں "بے ساختہ" کے عنوان سے کالم لکھے۔ روزنامہ " نئی بات" میں "سرکشی" کے عنوان سے کالم لکھ رہے ہیں۔ یہ سلسلہ جنوری ۲۰۱۲ء سے جاری وساری ہے۔

شادی واولاد

خاندانی معاملات ورسومات کو خندہ پیشانی کے ساتھ نبھاتے ہوئے حفیظ خان نے دو شادیاں کیں جو کہ اریخ میرج تھیں۔ پہلی زوجہ جبیں اختر سے ان کی شادی ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو ہوئی۔ ان کی دوسری شادی شاہینہ خان کے ساتھ ۱۰ فروری ۱۹۳۸ء میں ہوئی۔

حفیظ خان مُنصفانہ امور کے ساتھ انجام دہی گھر سے باہر نہیں کرتے تھے بلکہ گھر میں بھی ایک توازن بر قرار ہے یہی وجہ ہے کہ دوازدواج کے ہوتے ہوئے انہوں نے ایک کامیاب زندگی گزاری اور ان کی اولاد آج بڑے عہدوں پر فائز ہے۔ پہلی زوجہ جبیں اختر سے ان کی چار بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ ندا حفیظ، جہانزیب امان حفیظ، ہما حفیظ، وفا حفیظ اور ماریہ حفیظ ہیں۔ دوسری زوجہ شاہینہ خان سی ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ صبا حفیظ، لینہ حفیظ، نعمان حفیظ، حفیظ خان نے بتایا کہ جب وہ بی ایس سی کر رہے تھے ان دِنوں ان کے ہاں پہلی بیٹی ندا پیدا ہوئی۔ یہ ۱۹۷۷ء میں پیدا ہوئیں ندا نے لاء کیا ہوا ہے۔ ان کے شوہر منصور عطا آج کل بہاول پور میں سینئر سول جج ہیں۔ ندا کے بعد بیٹے جہانزیب امان حفیظ ہیں جو آج کل لاہور میں سول جج کے عہدے پر فائز ہیں۔ جہانزیب LLB اور MBA ہیں۔ ان کے بعد بیٹی ہما ہے۔ ہما نے انگریزی میں ماسٹر کیا ہے، وہ شادی شدہ ہیں اور ان کے سسرال والے بھی پڑھے لکھے ہیں۔ ان کے بعد وفا حفیظ ہیں جو ایم بی بی ایس ہیں۔ آج کل وہ ملتان انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی میں اینستھزسٹ ہیں۔ شادی شدہ ہیں۔ سابقہ گورنر لطیف کھوسہ کے بھتیجے کے ساتھ ان کی شادی ہوئی جو کہ سپریم کورٹ میں وکیل ہیں۔ اس کے بعد ماریہ حفیظ ہیں۔ ماریہ حفیظ نے MBA کیا ہے۔ دوسری بیگم سے بڑی بیٹی صبا حفیظ ہیں۔ وہ پہلی مسز سے بیٹی ڈاکٹر وفا حفیظ کی ہم عمر ہیں۔ صبا حفیظ ڈینٹل سرجن ہیں، ایف سی پی ایس ہیں، شادی شدہ ہو کر آج کل سکاٹ لینڈ میں ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر لینہ حفیظ ایم بی بی ایس ہیں، انہوں نے بھی ایف سی پی کیا ہے۔ اور نشتر ہسپتال ملتان میں سکن سپیشلسٹ ہیں۔ ان

کے بعد چھوٹا بھائی نعمان حفیظ ہے، انہوں نے بی ایس کرنے کے بعد NUST سے ابھی حال ہی میں ایم ایس کیا ہے، یہ کیمیکل انجینئر ہیں۔

جب والدین کی زندگی میں توازن ہو تو تب ہی اولاد اتنی قابل اور کامیاب ہوتی ہے۔ یہاں پر یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ حفیظ خان رسموں اور ذمہ داریوں کو جاننے، سمجھنے اور نبھانے والا انسان ہے۔ ان کی اولاد کی کامیاب زندگیاں اس بات کا ثبوت ہیں کہ انہوں نے کس قدر استحکام کے ساتھ اپنی زندگی کے دو پلڑوں کو تھامے رکھا۔ ایک کی طرف سے بھی گریز، غفلت یا چشم پوشی نہیں کی۔ ان کی دونوں بیگمات حیات ہیں اور ان کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی ہیں۔

تصانیف

حفیظ خان نے اردو اور سرائیکی دونوں زبانوں میں کام کیا ہے۔ ان کی اردو تصانیف کا جائزہ درج ذیل ہے:

۱۔ اردو افسانے

i۔ یہ جو عورت ہے

ii۔ حفیظ خان کی کہانیاں, ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان، ۲۰۰۷ء

iii۔ تن من سریر (اردو کہانیاں), ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان، ۲۰۱۶ء

۲۔ تاریخ و تنقید

i۔ اتفاق سے نفاق تک (پاکستان کی آئینی تاریخ کا ایک فسوں), ملوہا پبلشرز، ملتان، ۱۹۹۳ء

ii۔ مآثر ملتان, ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان، طبع اول ۲۰۱۱ء، طبع دوم ۲۰۱۳ء۔ اردو

۳۔ شاعری

i۔ پہلی شب تیرے جانے کے بعد، ملوہا پبلشرز، ملتان، ۱۹۹۹ء

۴۔ تحقیق و تنقید

i۔ نو آبادیاتی خطوں کا نیا مکالمہ، ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان، طبع اول ۲۰۱۴ء، طبع دوم، ۲۰۱۶ء

ii۔ کافی۔ وادی سندھ کی شعوری تاریخ، ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان، ۲۰۱۶ء

iii۔ پٹھانے خان فن اور شخصیت (تنقیدی کتاب)، ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان ، ۲۰۱۷ء

۵۔ منتخب کالموں کا مجموعہ

i۔ اس شہر خرابی میں، ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان، ۲۰۰۹ء

ii۔ سرکشی، ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان، ۲۰۱۷ء

۶۔ اردو ناول

i۔ ادھ ادھورے لوگ ،ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ ،ملتان طبع اول ۲۰۱۸ء، طبع دوم ۲۰۱۹ء

ii۔ انواسی، ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان، طبع اول ۲۰۱۹ء، طبع دوم، جہلم، ۲۰۱۹ء

iii۔ کرک ناتھ، بک کارنر، جہلم، ۲۰۲۰ء

iv۔ منتارا، صریر پبلیشرز، راولپنڈی، ۲۰۲۱ء

اعزازات

۱۔ رول آف آنر (یونی یورسٹی لاء کالج ملتان) ۱۹۷۸ء

۲۔ ہجرہ صدارتی ایوارڈ (اکادمی ادبیات پاکستان) ۱۹۷۹ء

۳۔ ہجرہ صدارتی ایوارڈ (اکادمی ادبیات پاکستان) ۱۹۹۰ء

۴۔ جشن تمثیل ایوارڈ (ریڈیو پاکستان ملتان) ۱۹۹۱ء

۵۔ پی ٹی وی ایوارڈ (بہترین سرائیکی ڈرامہ) ۲۰۰۳ء

۶۔ تمغہ امتیاز (نیشنل سول ایوارڈ گورنمنٹ آف پاکستان) ۲۰۱۱ء [۸]

ادبی امتیازات

حفیظ خان کی ادبی خدمات کے فن کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے مختلف ایوارڈز کے ساتھ ساتھ ان مختلف اداروں کی طرف سے امتیازی حیثیت بھی حاصل ہوئی۔ ان کے ادبی امتیازات سے متعلق ایک سوال کے میں انہوں نے بتایا کہ وہ:

۲۰۱۳ء میں پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کی جانب سے شائع ہونے والے " انسائیکلوپیڈیا آف ورلڈ لٹریچر " کے ایڈیٹوریل بورڈ ممبر بنے۔

ایوارڈ اکیڈمی۔ پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کے پینل آف ججز کے ممبر رہے۔

بالترتیب ۲۰۱۲، ۲۰۱۴، ۲۰۱۵ء، ۲۰۰۸ء، ممبر، پینل آف ججز" کمالِ فن ایوارڈ" پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز گورنمنٹ آف پاکستان رہے۔

بورڈ آف گورنرز پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز برائے سال ۲۰۱۸ء ۲۰۱۵ء ممبر نامزد ہوئے۔

حکومتِ چین کی جانب سے مدعو کیے گئے آٹھ روزہ سٹڈی ٹور میں شرکت کی جو یکم جون تا آٹھ جون ۲۰۱۵ء تک رہا۔

۲۰۱۶ء میں نیشنل بک فاؤنڈیشن گورنمنٹ آف پاکستان کی جانب سے "بک ایمبیسڈر" نامزد ہوئے۔[۹]

حفیظ خان کی شخصیت معاصرین اور دوستوں کی نظر میں

دراز قد، پُر کشش اور بارونق چہرہ، خوب صورت مردانہ وجاہت، گھنی مونچھیں، ناک پر عینک کے پیچھے ہر لمحہ کچھ سوچتی ہوئی اور کچھ بولتی ہوئی آنکھیں، ہر طرح کی منفی اور سفلی سوچ سے پاک ایک عجب سی پختہ معصومیت لیے ایک بارُعب سا چہرہ رکھنے والا، یہ ہیں حفیظ خان جن کو دیکھ کر لگتا ہے کہ شاید وہ ذہن کے ساتھ ساتھ چہرے سے بھی سوچتے ہیں۔ بظاہر کم گو ہیں۔ حفیظ خان ایک سنجیدہ طبع، نرم مزاج، ملنسار اور نہایت مہذب شخصیت کے مالک ہیں جیسے اپنی ہی ذات میں سمایا ہوا ایک شخص ہو۔ سلجھی ہوئی گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ صاف گوئی بھی ان کا وصف ہے اور سچ ان کی فطرت میں بسا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جج بننے کے بعد بھی ان کے اندر تخلیق کار اور قلم کار نہ نکل سکا۔ یہ قلم کار جو محسوس کرتا ہے سپردِ قلم کر دیتا ہے۔ حفیظ خان سادہ طبیعت کے مالک ہیں منصب کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں لیکن غرور نام کو نہیں۔ انسانیت اور آدمیت کے علم بردار، بااخلاق، ہلکی سی مسکراہٹ میں شناسائی لیے ہوئے ہیں۔ چشمِ بینا و چشمِ بصیرت دونوں کے مالک ہیں ۔اپنے فرائضِ منصبی کے ساتھ ساتھ ادبی خدمات بھی سرانجام دیتے ہیں۔ ذہانت ان کے چہرے سے ٹپکتی ہے اور بصیرت ان کی آنکھوں سے جھلکتی ہے۔ ان کے چہرے پر بلا کا اطمینان ہے۔ ایک انٹرویو کے دوران جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کو دیکھ کر ایک تازگی کا احساس ہوتا ہے، آخر چہرے پر یہ تروتازگی اور بشاشت کا راز کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا:

> "ایک تو یہ وجاہت ہماری خاندانی طور پر ہے۔ میرے والد صاحب ایک وجیہہ انسان تھے اور میں نے ان کے جیسا جاذبِ نظر اور وجیہہ شخص آج تک نہیں دیکھا اور دوسری بات یہ ہے کہ اللہ کا کرم ہے کہ میں نے آج تک کسی کا برا نہیں چاہا، بُرا نہیں کیا۔ کبھی کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ اگر میرے ساتھ کسی نے زیادتی کر بھی

دی ہے تو میں نے اسے بھی معاف کر دیتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ہمیشہ مطمئن رہتا ہوں۔"(۱۰)

حفیظ خان کے معاصرین اور احباب ان کی شخصیت کے بارے میں مختلف اخبارات میں چھپنے والے مضامین میں اپنی رائے دی ہے جو کہ درج ذیل ہے۔ الیاس میراں پوری اپنے ایک مضمون میں حفیظ خان کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

"میں اکثر سوچتا ہوں کہ تخلیق کار تو بنیادی طور پر رحم دل اور حساس ہوتا ہے۔ حفیظ خان ان دنوں منصفی کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ جب مجرم اپنی روایتی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے ان کے سامنے پیش ہوتے ہوں گے تو ان کے تاثرات کیا ہوں گے۔ ان کا دل پسیج جاتا ہو گا لیکن یہ دور اندیش واقع ہوئے ہیں۔ یہ پہچانتے ہوں گے کہ کون بے گناہ ہے اور کون گناہ گار؟ اتنے بڑے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود ان میں افسروں والا غرور و تکبر نام کو نہیں۔"(۱۱)

حفیظ خان ظاہری خوبصورتی کے ساتھ ساتھ باطنی خوب صورتی کے بھی مالک ہیں۔ ان کے عادات و خصائل اور اطوار ان کی باطنی خوبصورتی کے عکاس ہیں۔ الیاس میراں مزید لکھتے ہیں:

"حفیظ خان بڑے مہمان نواز اور سلیقہ شعار ہیں۔ ان کی پوری زندگی ایک ترتیب، و تہذیب اور توازن سے عبارت ہے۔ انہوں نے کبھی اس میں بگاڑ پیدا نہیں کیا۔ اصول پرست ہیں اس لیے اصولوں پر کبھی سودا بازی نہیں کی، سودے بازی کے اناڑی پن نے انہیں کئی نقصانات بھی پہنچائے ہیں۔ خان صاحب دلِ فطرت شناس کے مالک ہیں۔"(۱۲)

شیخ حبیب الرحمٰن بٹالوی اپنے مضمون "حفیظ خان دھوپ میں چھاؤں جیسا" میں ان کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

"دہرے بند کے سادہ طبیعت انسان، عہدے کے لحاظ سے عدالت کے پر دھان مگر غرور نہیں، آدمیت ان کی پہچان، خوش اخلاق، خوش گفتار۔ دل بھی شگفتہ، طبیعت بھی شگفتہ، گھنی پلکیں، گورا رنگ، گل کی طرح مسکراتا ہوا چہرہ، خوش لباس اور خوش مزاج، آنکھوں پر سنہری فریم کی عینک لگاتے ہیں جن میں شرافت اور بصیرت جھلکتی ہے۔ خوش لہجہ و خوش کام ایسے کہ زبان سے الفاظ نہیں گویا شاخوں سے کلیاں ٹوٹ

رہی ہیں۔ ادبی دنیا میں ایک متحرک، ایک مستعد کردار جو اپنے فرائضِ منصبی کے ساتھ ساتھ قلم و قرطاس کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں۔"(۱۳)

سرائیکی وسیب کی نمائندہ ادبی تنظیم سیول کے مرکزی عہدیداروں اور رفعت عباس نے اپنی گفتگو میں کہا کہ:

"حفیظ خان کے ساتھ کلام کرنا یہاں کے لاکھوں لوگوں کے ساتھ کلام کرنے کے مترادف ہے سرائیکی خطے میں حفیظ خان اپنی فکر کے اعتبار سے ایک نئی علامت کے طور پر سامنے آئے ہیں"(۱۴)

جبار مفتی نے انہیں محنتوں اور شہادتوں کا نشان قرار دیا اور ان کے بارے میں روزنامہ نوائے وقت ملتان میں لکھے جانے والے ایک مضمون میں حفیظ خان لکھتے ہیں کہ:

"بعض لوگ چو مکھی لڑنے کے عادی ہوتے ہیں بیک وقت کئی محاز کھول لیتے ہیں۔ قسمت یاوری کرے تو ہر محاذ پر کامران ہوتے ہیں۔ البتہ حفیظ خان نے یہ چو مکھی اپنی محنت اور ذہانت سے جیتی ہے۔ وہ ریڈیو پر اناؤنسمنٹ بھی کرتا رہا ہے۔ ڈرامہ نگاری میں بھی نام پیدا کیا۔ مختلف ماہناموں میں شاہکار افسانے بھی چھپوائے یونیورسٹی لاء کالج ملتان کے مجلہ "العدل" کی ادارت بھی سنبھالے رکھی اور ایل ایل بی کا نتیجہ نکلا تو ریگولر طلباء میں سب سے ممتاز نظر آیا"(۱۵)

مٹھل خان صفدر بلوچ اپنے ایک مضمون میں جو کہ نومبر ۱۹۹۸ء میں ماہنامہ "ماہِ نو" لاہور میں بعنوان "یہ جو عورت ہے" شائع ہوا۔ لکھتے ہیں کہ:

"حفیظ خان پیشے کے لحاظ سے ایک منصف ہیں مگر منصف سے زیادہ مصنف کے روپ میں معروف ہیں۔ انصاف کے شعبے سے تعلق رکھنے والے ادیبوں خصوصاً افسانہ نگاروں کی تعداد انگلیوں پر گنے جانے سے بھی کم ہے۔ انصاف کرنے کے ساتھ ساتھ کہانی بُننا ایک مشکل کام ہے۔ مگر حفیظ خان نے اسے پوری دیانت داری سے نبھایا ہے"(۱۶)

اپنی بااخلاق فطرت کے سبب حفیظ خان ایک وسیع حلقہ احباب رکھتے ہیں اور ان کے تمام دوست ان کی ہمدرد اور مخلص دوستی سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ وہ ایک دردمند دل رکھنے والے انسان ہیں جو کسی جانور کو بھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے یہی وجہ ہے کہ ان کی تحقیق بھی اس تعصب سے خالی نہیں۔ خصوصاً ان کے کالموں میں اس کی مثالیں ملتی ہیں حفیظ خان ظاہر اور باطن میں ایک مکمل اور بہترین شخصیت کے مالک ہیں۔

اکیسویں صدی کا ناول اور "انواسی" کی انفرادیت:

ناانصافی، رنگ و نسل، ظلم و ستم، جیسے معاشرتی مسائل ہمارے ہر دور کے ادب کا موضوع بنتے رہے ہیں۔ اکیسویں صدی میں بدلتے ہوئے تناظرات اور حالات نے ناول نگاری کو ایک نئی جہت دی فکری سطح پر ناول نگار متاثر ہوا اور ناول کے موضوعات کو وسعت ملی۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں جب جدید ذرائع ابلاغ نے فروغ پایا اور زبان کے حوالوں سے فاصلے سمٹنے لگے تو ادب میں بھی تبدیلی کے امکانات پیدا ہونے لگے۔ جدید وسائل میں جہاں رابطوں میں تیزی آئی تو ادب کی جمالیات پر بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہونے لگے۔ مختلف نظریات کا نفاذ اور مختلف زبانوں کے اشتراکات کی وجہ سے ادب میں بھی منفی اور مثبت دونوں پہلو نظر آنے لگے۔ اس امر کی ضرورت کا شدت سے احساس ہونے لگا کہ سماجی تیز رفتاری کے اس زمانے میں ایسی نثر کا بقا جو روایت سے بھی جڑی ہو اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ بھی تا کہ کلاسک کی تفہیم کے لیے بھی نئے اذہان تیار رہیں اور زبان کے جدید تناظر سے بھی آگاہ رہیں۔ اس ضرورت کو بہت سارے ناول نگاروں نے محسوس کیا اور اپنی تحریروں کو ان تناظرات میں پیش کیا۔

اکیسویں صدی اپنے ساتھ بے شمار ہنگامہ خیزیاں، چونکا دینے والے واقعات اور غیر روایتی رجحانات لے کر آئی اس کا اثر ادب پر بھی پڑا خاص طور پر ناول نگاری پر۔ اس دورانیہ میں چھپنے والے ناولوں میں بہت مختلف انداز کا کام نظر آتا ہے کہیں اس کا موضوع سماجی مسائل ہیں تو کہیں ثقافتی مسائل، کسی نے سیاسی ہلڑ بازی پر لکھا تو کسی نے نئے انسانی مسائل پر لیکن حفیظ خان اپنے ناول "انواسی" میں قدیم تاریخ کو زیرِ بحث لایا ہے۔ کہانی کا آغاز انیسویں صدی کے نصف آخر سے ہوتا ہے اور اسی کے اندر ختم ہو جاتا ہے۔ ناول کا موضوع بھی پرانا ہے یعنی ہندوستانی رعایا اور انگریز حکمرانوں کے مابین تعلقات، ذیل میں ہم اکیسویں صدی کے ناولوں کا مختصر تعارف کروانے کے بعد "انواسی" کے ساتھ ان کا تقابل کریں گے۔ اکیسویں صدی کی اردو ناول نگاری میں مستنصر حسین تارڑ کا نام بہت نمایاں ہے۔

مستنصر حسین کا ناول "قلعہ جنگی ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ ضخامت کے اعتبار سے یہ ایک مختصر ناول ہے اس میں افغانستان کے اندر برسرِ پیکار مجاہدین کی زندگیوں کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ پاکستان کے پہلو میں افغانستان ایک ایسی آگ میں جل رہا ہے جس کی تپش اور حدت پاکستان کے کونے کونے میں محسوس کی جا رہی ہے۔ روسی حملے کے بعد مجاہدین کی جہادی کاروائیاں پھر روس کا شکست کھا کے افغانستان سے نکلنا، خانہ جنگی کا

شروع ہونا، طالبان کا عروج، حکومت اور بالآخر امریکہ کا حملہ اور دوبارہ افغانستان کا جنگی ماحول میں چلا جانا یہ ایسے واقعات ہیں جن کی بازگشت ساری دنیا میں سنی جارہی ہے۔اس ناول میں بھی اسی جنگ کی بازگشت اور مجاہدین کی جدوجہد کو موضوع بنایا گیاہے۔بظاہر یہ کہانی مجاہدین کی ایک ٹولی کی موت کا منظر ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے ہزاروں واقعات سرِ زمین افغان پر رونما ہوئے جن کو جاننے کے بعد انسان اپنے انسان ہونے پر شرمندہ ہوتا ہے۔ڈیزی کٹر بموں کا انسانوں پر استعمال اور انسانوں کے چیتھڑوں کا اڑنا، قلعے میں پھنس جانے والے مجاہدین کی بے بسی کی موت اور ظلم وبربریت کی ہر وہ مثال انسان جس کا تصور بھی نہیں کر سکتا اس ناول کے اندر موجود ہے مستنصر حسین نے اسی بپھرے ہوئے جنگی جنون اور اس کے نتائج کو "قلعہ جنگی" میں پیش کیاہے۔ناول سے ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

> "سکول کے باہر کوئی بھی لاش ہو سکتی تھی۔بالکل اپنی یا سراسر پرائی۔ہاں یہ کہ وہ بچہ اگر شمال کا ہے تو پہلے روسی سے لاشیں مہیا کیا کرتے تھے پھر طالبان نے یہ ذمہ داری سنبھال لی اور ان دنوں پتا نہیں کون اس فرض کو سرانجام دے رہاہے۔ لاشوں کی سپلائی میں رخنہ نہیں پڑھ رہا تھا۔۔۔ چنانچہ ایک افغان بچے کے لئے موت سے زیادہ زندگی حیرت کا موجب بن سکتی ہے"(۱۷)

مستنصر حسین نے اس مختصر ناول میں افغان جنگ اور افغانستان کی صورتِ حال کا نقشہ اور قصہ موثر انداز میں پیش کیاہے۔

حاصل گھاٹ از بانو قدسیہ ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا۔ مشرقی زندگی اور اقدارِ زندگی کا مغربی زندگی اور اقدارِ زندگی سے الجھاؤ اور ٹکراؤ اور اس کے منفی اثرات اس ناول کا عمومی موضوع ہے۔اس ناول میں تہذیبی ٹکراؤ کی کہانی ہی نہیں بلکہ نظریات، عقائد فلسفوں اور خیالات و افکار کے نتیجے میں پیدا ہونے والی منتشر ملکی و عالمی صورتِ حال کو بھی موضوع سخن بنایا گیاہے۔

مغربی اقوام اپنے مفادات کے حصول اور تحفظ کے لئے دورِ قدیم سے مختلف حربے اور ہتھکنڈے اپناتی رہی ہے ان کے یہ مفاداتی حربے کبھی نو آبادیاتی نظام کی صورت حال میں کبھی مابعد از نو آبادیاتی نظام کی صورت میں جلوہ گر ہوتے رہے ہیں۔مابعد نو آبادیاتی نظام آج کی تیسری دنیا کے ممالک کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ترقی یافتہ مغربی اقوام نے اپنی حیثیت مستحکم کرنے کے لیے نئی آبادکاریوں کی بجائے ان ممالک کے نوجوانوں کے ذہنوں کو اس طرح تیار کیاہے کہ وہ اب مغرب کی آنکھ سے دیکھتے اور سنتے ہیں۔پاکستان میں

نوجوان نسل میں بھی دو واضح گروہ وجود میں آئے ہیں ایک وہ جو مغرب کو اچھا اور انسانیت کا نجات دہندہ سمجھتے ہیں اور دوسرے وہ جو اس سوچ کو ملک و ملت اور مذہب کے لیے انتہائی خطرناک تصور کرتے ہیں۔ یہ پوسٹ کلونیل ازم کی اعلیٰ مثال ہے جہاں بغیر کسی بڑی محنت اور کوشش کے دنیا ذہنی طور پر وہی کر رہی ہے جو مغربی اقوام ان سے چاہتی ہیں۔ حاصل گھاٹ میں بھی اصل میں زیرِ بحث اسی کشمکش کو بیان کیا گیا ہے۔ جدید دور میں اقوامِ مغرب دو محاذوں پر اپنے مفادات کو یقینی بنا رہی ہیں ایک تو وہی ذہن سازی ہے اور دوسری طاقت کا بے جا استعمال۔ اس سارے منظر نامے میں ایک پاکستانی کیسے سوچتا ہے، افغانستان پر امریکہ کے حملے کے حوالے سے ایک اقتباس پیش خدمت ہے۔

> "میں گیارہ ستمبر سے پہلے بھی لبرل تھا بابا جان۔ کیونکہ میں کسی خیال، مسلک، مذہب ،ملک، خاندان سے وابستہ نہیں تھا نا میری جڑیں کہیں تھیں، نہ میرا دماغ کہیں تھا۔ جو آدمی نہیں بندھا ہو وہ آسانی سے لبرل نہیں ہو سکتا۔ گیارہ ستمبر کے بعد پتہ نہیں کیوں میں نے نوکری چھوڑ دی اور تاریخ پڑھنا شروع کر دی میں اس کے ایکشن کا جواز ڈھونڈنا چاہتا تھا میں نے ظلم کی تاریخ کو بہت مقامات پر سٹڈی کیا کشمیر، بوسینیا، چیچنیا، ہلاکو، نادر شاہ، جہانگیر ، کھال کھینچوانے کے واقعات ، پنجروں میں بند قیدی، ہٹلر ،ہیروشیما اتنے سارے مظالم جو انسان پر گزرے انہوں نے مجھے اور لبرل کر دیا"(۱۸)

آج کا انسان محض ملکی سطح تک کے معاملات پر نظر نہیں رکھتا بلکہ اس کے شعوری سرمائے میں قدیم و جدید اور ملکی و بین الاقوامی حالات بھی شامل ہیں۔ بانو قدسیہ نے حاصل گھاٹ میں ان تمام معاملات کو مکمل فنی مہارت سے بیان کیا ہے۔

خالد فتح محمد کا ناول "خلیج" ۲۰۰۸ء میں منظرِ عام پر آیا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا ناول "کئی چاند تھے سرِ آسماں" ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا۔ جس کا موضوع ہندو اور اسلامی تہذیب، اور تاریخی پسِ منظر میں محبت کی کہانی ہے۔ مرزا اطہر بیگ کا ناول "غلام باغ" اپنے اندر بیک وقت کئی رجحانات سمیٹے ہوئے ہے۔ طاہرہ اقبال کا ناول "مٹی کی سانجھ" تہذیبی اور ثقافتی عناصر کا آئینہ دار ہے۔ "نیلی بار" بھی طاہرہ اقبال کا ناول ہے جس میں دریائے راوی اور ستلج کے درمیانے علاقے کا بیانیہ ہے یونس جاوید کا ناول "کنجری کا پُل" اس میں معاشرے کی سچائیوں اور دوزخی زندگی کا بیان ملتا ہے۔ نعیم بیگ کا ناول "ڈیوس علی اور دیا" ایک سنجیدہ موضوع ہے اس میں معاشرے میں بڑھتی نا انصافی اور انتشار، عام انسان کے ساتھ طاقت ور افراد کے رویے کو دکھایا گیا

ہے۔ علی اکبر ناطق کا ناول "نو لکھی کوٹھی" تقسیم کے حوالے سے ہے۔ اختر رضا سلیمی کا ناول "جاگے ہیں خواب" قاری کو ماضی، حال اور مستقبل سے ماورا کرتا ہے، سانحہ بالاکوٹ اور معاشرے میں سماجی اور ثقافتی تبدیلیوں کو سامنے لایا گیا ہے۔ زاہد حسن کا ناول "قصہ عاشقاں" میں لاہور کی ادبی اور تہذیبی زندگی، بین الاقوامی سطح پر ہونے والی معاشی اور سیاسی تبدیلیوں کے پاکستان پر ہونے والے اثرات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ صلاح الدین پرویز کا ناول "دی وار جرنلس" میں امنِ عالم کو درپیش مسائل، عراق، افغانستان، پاکستان، اور ہندوستان میں رونما ہونے والے حادثات کے واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔

جاگنگ پارک از نکہت حسن ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔ مصنفہ کے پیش نظر دورِ حاضر کا انسان اور اس کے مسائل ہیں۔ انسان کی ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں کو بیان کرنے کی بجائے نکہت حسن نے ان کی وجہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ناول کو دور جدید کے تین اہم مسائل اور ان کے اثرات کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے ۔ صنعتی ترقی اور اس کے اچھے اور بُرے اثرات ،عالمی کشمکش اور نائن الیون کا واقعہ ،انسانی صحت اور بسیار خوار کی۔ ان میں اہم موضوع تو نائن الیون ہی ہے باقی دو اس کی ذیل میں بیان ہوئے ہیں۔ دنیا کی بے پناہ ترقی نے انسانیت سوز معاشرے کو جنم دیا اس مشینی ترقی نے مشینوں کے ساتھ انسانی احساسات کو بھی مشینوں کی طرح بے رحم اور بے حِس کر دیا۔ گلوبل ولیج میں تشکیل پانے والی دنیا کے مسائل بھی انوکھے انداز میں سامنے آئے۔ عالمی حالات و واقعات اب گھر کے حالات و واقعات کی مانند محسوس کیے جانے لگے۔ اس ناول کا ایک کردار جو پیشے کے لحاظ سے صحافی ہے ناول کے مرکزی کردار زبیدہ سے ایک سوال کرتا ہے کہ آیا وہ ٹوین ٹاور کے حادثے کا سن کر روئی تھی؟ اس سوال کے جواب میں زبیدہ جو کہتی ہے وہ اس دور کی سوچ کی عکاسی ہے۔

> "ٹوین ٹاور تو اب گرے ہیں۔ بیٹا جی میں تو ۱۹۴۵ء کا واقعہ تاریخ میں پڑھ کر رو رہی ہوں جب ۶ اگست ۱۹۴۵ء کی صبح سوا آٹھ بجے ہیروشیما کی ہستی بستی، بستی پر حقوقِ انسانی کے دعوے داروں نے سب سے پہلا ایٹم بم گرا کر دو لاکھ معصوموں کا قتلِ عام کیا اور بربریت کا نیا عالمی ریکارڈ قائم کیا اور اس کے بعد سال ڈیڑھ سال کے وقفے کے ساتھ دنیا میں مختلف ممالک میں اس قسم کے حملے ہو رہے ہیں۔ کون سا ملک ہے جو ان حملوں سے محفوظ ہے؟ کیا چین، کیا کوریا، انڈونیشیا، گانگو، ویتنام، کمبوڈیا، لیبیا،

پانامہ، عراق، سوڈان، فلسطین، بوسینیا، اور اب افغانستان رونے کے لیے تو پوری زندگی
ناکافی ہے اور میری طاقت نہیں کہ کسی نوحہ گر کو میں ساتھ رکھوں "(۱۹)

مادی لحاظ سے ترقی یافتہ دنیا میں مشینوں نے انسانی جذبات کے ساتھ ساتھ جسمانی سرگرمیوں کو بھی محدود کر دیا ہے۔ انسان پہلے سے زیادہ سہل پسند اور آرام طلب ہو چکا ہے۔ من پسند غذاؤں اور کثرت خوراک نے انسانی صحت پر بہت اثرات مرتب کیے ہیں۔ جاگنگ پارک اصل میں ایک علامت ہے انسانی رویوں اور فکر و نظر کی۔ یہ پارک ایک ایسی مخلوق سے بھرا پڑا ہے جو سکھی ہے، محرومیوں کا شکار ہے۔ مصنفہ نے ملکی سطح سے لے کر عالمی سطح تک کا منظر اس جاگنگ پارک میں لا کھڑا کیا ہے۔ ایک عورت جو پارک میں جاگنگ کے لئے آتی ہے پارک میں کام کرنے والے مالی کو سمجھاتی ہے کہ تمہاری بیوی مر جائے گی وہ اتنے بچوں کی متحمل نہیں ہو سکتی تو مالی اُسے اس طرح جواب دیتا ہے۔

"کوئی نہیں مرتی سب فضول باتیں ہیں۔ ہر جی اپنا رزق لے کر خود آتا ہے۔ تمہارے
بچے نہ گھر کے نہ گھاٹ کے۔ پیدا ہوتے ہی امریکہ بھیج دیتے ہو وہاں کوئی طالبان بن کر
آتا ہے تو کوئی اسامہ اور کوئی مُلا عمر گولیاں تو ہمارے بچے کھاتے ہیں۔ ہم میں بچہ پیدا
نہیں کریں گے تو گولیاں کھانے کے لیے بچے کہاں سے آئیں گے "(۲۰)

مالی کے کردار سے اس قسم کی فلسفیانہ گفتگو ظاہر کرتی ہے کہ دورِ حاضر کا ایک عام انسان بھی حالات سے کس قدر متاثر ہے۔ ناول میں ذات سے لے کر کائنات تک کا درد موجود ہے۔

آخری زمانہ از آمنہ مفتی ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا۔ آخری زمانہ اصل میں دنیا کے اختتام کی ایک علامت ہے۔ مصنفہ نے ان تمام علامات کو بہ نظر غائر دیکھا ہے جو دنیا کے اختتام سے پہلے وقوع پذیر ہونا تھیں۔ ظلم و زیادتی، ناانصافی، جنون، تہذیبی ٹکراؤ، مفادات کی جنگ، افراتفری کا زور وغیرہ مجموعہ اضداد بن کر آخری زمانے کی پیش گوئی کر رہے ہیں۔ انسان بے یقینی کی دنیا میں رہتے ہوئے بھی ایک عجیب سی ہوس اور لالچ کے ساتھ ساتھ ان جانی منزل کی طرف رواں دواں ہے اور اس سے آری ہے کہ اس کا انجام کیا ہونے والا ہے ۔ چلے جا رہے ہیں مگر پتا نہیں کدھر جا رہے ہیں، اسی عصری موضوع کو آمنہ مفتی نے اپنے ناول "آخری زمانہ" کی زینت بنایا ہے۔

ایک گھر اور خاندان، ایک شہر اور ایک ہی ملک میں رہنے والے افراد آپس میں کس طرح دست و گریباں ہیں اس کا نقشہ مصنفہ نے جزیات کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ ایک دوسرے سے فکری، سماجی اختلافات

رکھنے والے یہ افراد کہنے کو زندگی کی تلاش میں ہوتے ہیں مگر ان کے رویے اور کردار کسی طور بھی زندگی سے کوئی مماثلت نہیں رکھتے۔ ناول دیہات کی سادہ اور پُر خلوص فضا سے شروع ہوتا ہے جہاں زندگی فطرت کے نہایت قریب ہوتی ہے اور پھر یہ فضا آہستہ آہستہ مکدر ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایک دم تہذیبی رنگارنگی میں تلاطم برپا ہو جاتا ہے۔ جلسے اور جلوس شروع ہو جاتے ہیں، نعروں اور تقریروں کا شور بلند ہوتا ہے زندہ باد اور مردہ باد کی آوازیں تنگی حالات کا فسانہ سناتی ہیں یونیورسٹیز میں سیکولرازم اور مذہبی انتہا پسندی کا فروغ ہوتا ہے ، حکومتیں بنتی اور بکھرتی چلی جاتی ہیں۔ ریاست مجموعہ اضداد بن کر ایک ہوائی دنیا کی صورت پیش کر رہی ہوتی ہے۔ دھماکے ، دہشت و وہشت اور بربریت کا راج ہوتا ہے۔ انہی حالات سے طلوع ہوتا ہوا آخری زمانہ اہل بینش کو سامانِ فکر پیش کرتا ہے۔ راحیلہ جو اس ناول کا ایک کردار ہے وہ اس عالمی کشمکش اور بکھرتی ہوئی تہذیب اور انسانیت کو اس طرح بیان کرتی ہے، مگر یہ جمہوری حکومتیں بھی۔۔ انہوں نے کیا کیا؟ اتنی کرپشن ؟ماموں ہم اتنے کمینے کیوں ہو گئے ؟راحیلہ مزید کہتی ہے۔

> "۱۹۷۲ء سے کابل میں پشتون تھے پھر ربانی آیا جو کہ تاجک ہے، اب یہ پشتون اسے یہاں سے نکال کر ہی دم لیں گے ۔ ادھر ایران ہے جو شیعوں کو امداد دے رہا ہے ہرات کے لئے تو ایران کی جان جاتی ہے۔ انڈیا کو ربانی عزیز ہے"(۲۱)

یہ اقتباس افغانستان کے بارے میں ایک تجزیہ ہے جہاں ہر ملک اپنے اپنے مفاد کی جنگ لڑ رہا ہے حالاں کہ بحیثیت مسلمان تمام مسلمانوں کے مفادات ایک ہوتے ہیں مگر کیوں کہ یہ آخری زمانہ ہے اس لیے انسان ذاتی مفاد کی خاطر گروہوں میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے کے درپے ہے۔ تاجک ، پشتون ، ایران اور پاکستان کی جغرافیائی اور لسانی تقسیم نے مسلمانوں کی وحدت کو تقسیم کر کے ایک بکھری ہوئی تہذیب کو فروغ دیا ہے۔

وحید احمد کا ناول مندری والا ۲۰۱۲ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس کا بڑا موضوع عصرِ حاضر کا سب سے بڑا المیہ یعنی دہشت گردی ہے۔ دہشت گردی بھی عام اور روایتی حملوں سے نکل کر جدیدیت اختیار کر چکی ہے اور اس میں خودکُش حملوں ، کیمیائی جنگوں میں سمیت فدائی حملوں کی نئی اور خوف ناک تکنیک اختیار کی گئی ہے۔ ناول میں دھماکا خیز مواد کی فراہمی اور اس کے اثرات کو جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اکیسویں صدی پاکستان کے لیے ایک خوف ناک صورت میں نمودار ہوئی ملک دشمن عناصر پہلے سے زیادہ سرگرمی سے پاکستان کی سالمیت کے درپے ہوئے ۔ لاکھوں معصوم لوگ اس دہشت گردی کا نشانہ بنے ۔ سافٹ ٹارگٹ

یعنی جلسے، جلوس سکول، مساجد، پارکس وغیرہ اس دہشت گردی کا عمومی نشان رہے۔ اس ناول میں ایک جگہ اسی طرح کے ایک حملے کا ذکر کیا گیا ہے۔

"اچانک جلسے کے وسط میں ایک انسانی بم پھٹا۔ دھوئیں اور شعلوں کا بادل ابھرا۔ گوشت نے شکلیں بدلیں جلسے کا قلب قصاب کی دکان تھی۔ قیمہ، بڑی چھوٹی بوٹیاں، ہڈیوں کے ٹکڑے، خون کے دھبے، کٹی ہوئی کھوپڑیوں سے جھانکتی ہوئی بے نیاز آنکھیں، انتڑیاں، بکھری ہوئی انگلیاں، سمٹے ہوئے دل جن کے اوپر لوگ صور اسرافیل کی بانگ سن کر سراسیمگی کے عالم میں بھاگ رہے تھے اس اندھا دھند بھاگ دوڑ سے جو لوگ روندے جا رہے تھے ان میں خودکش کا سر بھی تھا"(۲۲)

بڑا ہی مکمل اور پُر ہول نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ آج کا پاکستانی ایسے منظر کو بخوبی جانتا ہے اور ایسے ہزاروں مناظر ان کی نگاہوں اور یادداشتوں میں محفوظ ہیں۔ مصنف نے کمال مہارت سے اس ناول میں ملکی اور قومی المیے کو بیان کیا ہے۔

حال ہی میں محمد عاصم بٹ کا شائع ہونے والا ناول "بھید" جو ۲۰۱۸ء میں منظر عام پر آیا اپنی نوعیت کا ایک اہم ناول ہے۔ اس ناول میں پاکستان کے موجودہ حالات کے بارے میں بتایا گیا ہے ایک عام پاکستانی جو اپنی زندگی کے مسائل میں الجھا اور بکھرا ہوا ہے اس کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ ناول کا موضوع پاکستان کی شہری اور دیہاتی زندگی کے بارے میں ہے لیکن اس میں ہمیں نائن الیون کے اثرات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جس کی وجہ سے پورا ملک ایک طویل مدت تک افراتفری کے عالم میں رہا اور دہشت گردی نے ملکی حالات کو درہم برہم کر دیا جس کے سبب ملک میں ایک ناسوگوار فضا نے جنم لیا۔ اس ناول کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک عام پاکستانی کی فکری کیفیت کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ناول میں مختلف ملکی مسائل کو زیرِ بحث لایا گیا ہے جیسے ملاوٹ، کھانے پینے کی اشیاء کی کمی اور منافع خوری کو عمومی طور پر شامل کیا گیا ہے۔ عام سطح کی زندگی کی عکاسی ایک اور کردار کے ذریعے یوں کی گئی ہے:

"اس چائے میں بال صفا پاؤڈر ڈالتے ہیں۔ سفید سفوف کی صورت دودھ کی جگہ اسے بیچنے والے بھی دودھ نہیں کہتے، ٹی واٹنر کہتے ہیں۔ کبھی غور سے وہ پیپر دیکھو صاف لکھا ہے کیمیکل۔ اور چائے کی پتی وتی بھی کچھ نہیں ہوتی پینٹ والا رنگ ڈالا ہوتا ہے تب ہی

تو اِدھر پانی ڈالو اُدھر رنگ نکل آتا ہے۔ اتنی جلدی رنگ چھوڑنے والی پتی کبھی سنی ہے"[۲۳]

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح ملک میں بے ایمانی کا بازار گرم تھا اور لوگ بھی اس کے عادی ہو گئے تھے، یہاں تک کہ ملاوٹ جیسے گھناؤنے عمل کو بھی اُنہوں نے معمول بنا رکھا تھا جس سے انہیں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی تھی۔

طاؤس فقط رنگ نیلم احمد بشیر کا ناول ۲۰۱۸ء میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ دورِ حاضر پر آشوب سیاسی و سماجی، معاشی اور معاشرتی حالات کے جلو میں جنم لینے والا بیانیہ ناول ہے جس کا عنوان علامہ اقبال کے ایک معروف مصرعے "بلبل فقط آواز ہے" طاوس فقط رنگ سے اخذ کیا گیا ہے۔ ناول کا بیشتر حصہ امریکہ کی سرزمین کے متعلق ہے۔ مصنفہ کیوں کہ مغربی تہذیب کے اندرون کو اچھی طرح سمجھ چکی تھیں اس لیے انہوں نے مغربی تہذیب کی خوب صورتی اور کشش کو محض خوب صورت رنگ قرار دیا ہے کیوں کہ اس تہذیب میں ظاہری کشش تو ہے مگر یہ ایک ایسا فریب ہے جسے انسان دیکھ تو سکتا ہے مگر چُھو نہیں سکتا جس طرح سایہ نظر تو آتا ہے مگر اس کو پکڑا نہیں جا سکتا اسی طرح یہ رنگ نظر تو آتے ہیں مگر ان کا لَمس ناممکن ہے۔ مغرب کی تہذیب انسانوں کو بھلی تو محسوس ہوتی ہے مگر انسان جب اس کے اندر جا کر اسے محسوس کرتا ہے اور اس کے ترکیبی نظام کو سمجھتا ہے تو اسے سمجھ آتی ہے کہ یہ مغربی نظامِ زندگی کس قدر مکروہ اور منافقانہ ہے۔ طاوس فقط رنگ کا کینوس بڑا وسیع ہے۔ یہ ناول گلوبلائزیشن اور اس کی ذیل میں جنم لینے والے واقعات کی عمدہ پیش کش کیا گیا ہے۔ اس میں مشرق و مغرب کی تہذیبی اقدار کے درمیان کش مکش کو پیش کیا گیا ہے یہ کش مکش ہمیں سیاسی، معاشی معاشرتی اور مذہبی صورت میں نظر آتی ہے۔

کہانی کا آغاز نیلم احمد بشیر نے گیارہ ستمبر کے ہولناک واقعے سے کیا ہے مگر اس کے پس منظر کو پیش کرنے کے لئے انہوں نے فلیش بیک کی تکنیک استعمال کی ہے اور بیسویں صدی کی آخری دہائیوں سے ناول کو اکیسویں صدی کے واقعات سے ملا کر پیش کیا ہے۔ طاؤس فقط رنگ امریکہ کے حوالے سے جدید انسان کی شناخت کے بحران کو بیان کرتا ہے۔ اس ناول کے اہم کرداروں میں جیم جونز، جوڈاسو، لیو، قمر النساء پاکستانی نژاد اور برائن چینی نژاد شامل ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر ذیلی کردار بھی اس ناول میں جابجا نظر آتے ہیں جو کسی نہ کسی نفسیاتی الجھن کا شکار نظر آتے ہیں جس کی جڑیں نائن الیون سے جڑی ہوتی ہیں۔ اس واقعے کے بعد امریکہ میں پاکستانی لوگوں کو بہت سارے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ نیلم بشیر نے اس مسئلے کو نہایت مہارت کے

ساتھ اپنے فن سے ملا کر پیش کیا ہے۔ یہ ناول پاکستانیوں کی داخلی و خارجی اور نفسیاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے۔ اس ناول میں ایک خاص پیچیدہ نظامِ فکر کو پیش کیا ہے اور اہم ترین بات یہ ہے کہ اس فکری نظام کو کسی ایک علاقے سے مخصوص نہیں کیا بل کہ اس نظام میں مشرق و مغرب کی مشترکہ سوچ کبھی اکٹھی اور کبھی الجھتی نظر آتی ہے۔ ناول نگار نے ۱۹۷۰ء میں شمالی گیانا میں ہونے والے انسانی حقوق کی پامالی کو نائن الیون کے بعد رونما ہونے والے واقعات سے ملا کر پیش کیا ہے۔ ایک بھرپور عصری شعور اس ناول میں نظر آتا ہے جو سرحدوں یہاں تک کہ مذاہب کی پابندیوں سے بھی آزاد نظر آتا ہے۔ اس آزاد سوچ اور فکر کی عکاسی امریکی لڑکی ڈی لائلہ کے اس مکالمے سے ہوتی ہے جو وہ اس ناول کے ایک اور مسلمان نسوانی کردار سے کرتی ہے۔

"میں آپ کی زبان میں عربی دعائیں ٹیپ کروں گی تو گاڈ مجھے بھی Bless کرے گا نا ؟میرا آپ کا God تو ایک ہی ہے ناں، ہم سب ایک ہی تو مالا میں پروئے ہوئے موتی ہیں۔ ہم غیر تھوڑی ہی ہیں"(۲۴)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ حساس طبیعت انسان خواہ کسی مذہب اور کسی ملک سے تعلق رکھتا ہو وہ انسانی بنیادوں پر انسانوں سے ہمدردی اور خلوص رکھتا ہے۔ ناول کا بنیادی پیغام یہی ہے کہ انسان کسی جگہ کا ہو اس کو انسان ہی سمجھنا چاہیے اور یہ کہ دہشت گردی اور دہشت گرد کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اسی لئے انسانوں کے دکھ سُکھ اور خوشیاں بھی سانجھی ہونی چاہیں۔

ڈاکٹر محمد شیراز کا ناول "ساسا" ۲۰۱۹ء میں منظرِ عام پر آیا یہ ناول ایک پرندے کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس ناول میں بھی عالمی منظر نامے کو پیش کیا گیا ہے۔ ڈیرہ اسماعیل خان کے نوجوان سلیم اور منزہ کی کہانی سے ناول کی شروعات کی ہے اور پھر اس کے کینوس کو وسیع کرتے ہیں اس میں اقوام کی کش مکش اور غریب طبقے کے خیالات کو پیش کیا گیا ہے۔ سلیم کی کہانی ی ڈیرہ اسماعیل خان سے شروع ہوتی ہے وہ ایک لڑکی منزہ سے محبت کرتا ہے جو ناکام ہو جاتی ہے۔ سلیم اس کے بعد امریکہ چلا جاتا ہے امریکہ میں دورانِ تعلیم اس کو اینا اور پھر جینی سے محبت ہوتی ہے۔ وہ پہلے اینا سے محبت کرتا ہے مگر اینا کی دوستی ایک ہندوستانی لڑکے سے ہوتی ہے اس بات کو سلیم اچھا نہیں سمجھتا اس لیے وہ جینی سے محبت کرنے لگتا ہے۔ جینی بھی اس سے محبت کرتی ہے اس کے پاس ایک ساسا نامی پرندہ ہوتا ہے جس کی وہ انسانوں کی طرح پرورش اور دیکھ بھال کرتی ہے۔ نائن الیون کے بعد امریکہ میں حالات یکسر تبدیل ہو جاتے ہیں سلیم بھی ان حالات کی بھینٹ چڑھتا ہے اور اسے

پاکستانی ہونے کی وجہ سے سخت ترین مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس واقعے نے نفسیاتی لحاظ سے لوگوں کے اذہان کو تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔ مغرب میں سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں ہوں یا مادہ پرستی، مشرق میں جاگیر دارانہ نظام اور فرقہ واریت کی تباہ کاریاں ہوں یا طاقتور اقوام کی کم زور ملکوں پر یلغار اس سب کو مصنف نے نہایت باریک بینی کے ساتھ ناول میں بیان کیا ہے۔ وہ خاص نفسیاتی نظام جو ان کے حالات کی وجہ سے تخلیق ہوا اس کو بھی بہت مؤثر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً امریکہ میں بوسٹن کی میراتھن ریس میں ہونے والے بم دھماکے پر سلیم ایک دم سے ایک انجانے خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ عدم تحفظ اور بے یقینی کی لہر اسے گھیر لیتی ہے اسے یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ اس بم دھماکے کے اثرات نہ صرف اس کی ذات پر مرتب ہوں گے بلکہ وہ اپنے ملک کے حوالے سے بھی پریشان ہو جاتا ہے وہ جس خاص نفسیاتی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے اس کا اظہار اس اقتباس سے ہوتا ہے۔

> "اپنے ملک اور بم کا ذکر میں نے کوئی پہلی بار نہیں سنا تھا مگر بوسٹن کے میراتھن میں بم ہونا بہت مہلک ہے۔ میرے ملک میں آج بھی لوگ یہ دعا کرتے ہیں کہ خدایا یہاں جتنے بھی دھماکے ہونے ہیں ہو جائیں مگر امریکہ کے ٹاوروں کو، چوکوں کو، سینماؤں کو، گھروں کو اور گلیوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھنا کیوں کہ انہیں معلوم ہے کہ امریکہ میں دھماکے کا ذمہ دار کوئی بھی ہو مگر خراج ہماری دنیا کو ادا کرنا پڑتا ہے"(۲۵)

اپنے ملک کی حفاظت کی دعا کے بجائے امریکہ کی حفاظت کی دعا اصل میں عدم تحفظاتی کیفیت کی عکاسی ہے۔ پاکستانیوں کو معلوم ہے کہ امریکہ میں ہونے والے ہر واقعے کی کڑی پاکستان سے جوڑ کر ایک اور طوفان کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ ناول کے اندر دو مختلف دنیاؤں کا سفر پہلو بہ پہلو نظر آتا ہے ایک دنیا طاقت ور اور ظالم اور دوسری دنیا کم زور اور مظلوم۔ ظالم اور مظلوم کی یہ کشمکش اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ حالات کا تجزیہ بھی خوب صورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ناول میں میں محکوم اور غریب انسانوں کی بربادی کا ماتم اور امیر اور طاقت ور ملکوں کے رقصِ ابلیسی کو دو الگ دنیاؤں کے طور پر پیش کر کے اس نسلی اور گروہی تعصب کو نشانہ بنایا گیا ہے جو انسانوں کو اعلیٰ اور کم تر کی تفریق میں الجھا رہا ہے۔ آج کے وہ تمام حالات جو اس خود ساختہ حادثۂ عظیم کی وجہ سے رونما ہوئے پورے مہارت سے ناول میں پیش کئے گئے ہیں۔

یہ چند ناول لے کر ان کا مختصر ترین خاکہ پیش کر کے ناول اور عصریت کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اکیسویں صدی کے حالات کے تناظر میں ایسے اردو ناول تخلیق ہوئے جو اپنے

اندر ان تمام حالات و واقعات کا احاطہ کرتے ہیں جو اس صدی کی جلو میں نمودار ہوئے۔ ادیب معاشرے کا حساس ترین شخص ہوتا ہے اور وہ رواں حالات سے اپنی تخلیق کا احاطہ کر کے اپنے مدعا کو بصورت ادبی تخلیق پیش کرتا ہے۔ اس کا مشاہدہ ہر چیز کو ہمہ پہلو طریقے سے ناپ تول کا بیانیہ پیرایہ عطا کرتا ہے۔ اکیسویں صدی میں لکھے جانے والے نالوں میں بہت سے ناولوں کا موضوع مشرقی و مغربی اقدارِ زندگی کا ٹکراؤ ہے جو سب سے نمایاں بانو قدسیہ کے ناول "حاصل گھاٹ" میں ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے اس کے علاوہ "ساسا"اور "دی وار جرنلس میں یہ ٹکراؤ نمایاں ہیں۔ اسی طرح افغانستان میں جنگ اور اس سے پھیلنے والی بدامنی بھی کئی ناولوں کا موضوع بنی، مستنصر حسین تارڑ کے ناول قلعہ جنگی کا موضوع یہی ہے، مندری والا، بھید، طاؤس فقط رنگ، دی وار جرنلس میں بھی تقریباً اسی طرح کے موضوع دیکھنے کو ملتے ہیں۔

دہشت گردی کا مسئلہ وحید احمد کے ناول "مندری والا" کا بھی موضوع ہے، دہشت گردی جزوی طور پہ قلعہ جنگی، مندری والا، جاگنگ پارک، طاؤس فقط رنگ، کنجری کا پل، جاگے ہیں خواب میں بھی موضوع بنی اور اسی طرح کی بدامنی ہمیں ان میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔

دورِ حاضر کے انسانی مسائل کو نکہت حسن کے ناول "جاگنگ پارک "میں بیان کیا گیا ہے، اس کے علاوہ مندری والا، قلعہ جنگی، حاصل گھاٹ، طاؤس فقط رنگ، کنجری کا پل، جاگے ہیں خواب، ان ناولوں میں بھی انسانی مسائل کو بھی موضوع بنا کر ان کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دنیا کا اختتام، آمنہ مفتی کے ناول" آخری زمانہ" کا موضوع ہے۔ اس عرصے میں کسی اور ناول کا ایسا موضوع نہیں ملتا۔

غریب کے حالات اور قوامِ عالم کی کشمکش، ڈاکٹر محمد شیراز کے ناول "ساسا"کا موضوع ہے۔ یہ موضوع جاگنگ پارک، حاصل گھاٹ، طاؤس فقط رنگ، کئی چاند تھے سرِ آسماں، مٹی کی سانجھ، نیلی بار، کنجری کا پل، ڈیوس، علی اور دیا، نو لکھی، جاگے ہیں خواب، قصہ عاشقاں، دی وار جرنلس پر بھی چھایا ہوا ہے، ان سب ناولوں میں بھی غریب کی حالت اور اقوامِ عالم کی کشمکش کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

پُر آشوب سیاسی و سماجی حالات، نیلم بشیر کے ناول طاؤس فقط رنگ کا موضوع ہے۔ اس کے علاوہ بھید، جاگنگ پارک، مندری والا، قلعہ جنگی، ان سب ناولوں میں بھی ہمیں شہروں کی تباہ کاری اور ملک میں سیاسی و سماجی حالات کی منظر کشی کی گئی ہے۔

ہندو اور اسلامی تہذیب کا پسِ منظر، شمس الرحمان فاروقی کے ناول کئی چاند تھے سرِ آسماں کا موضوع ہے۔ مٹی کی سانجھ، نو لکھی کوٹھی، میں بھی ہمیں اسی طرح کے موضوع دیکھنے کو ملتے ہیں جو مختلف تہذیبوں کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔

تہذیبی و ثقافتی عناصر کا آئینہ دار، طاہرہ اقبال کے ناول مٹی کی سانجھ کا موضوع ہے۔ کئی چاند تھے سرِ آسماں، طاؤس فقط رنگ، ساسا، جاگنگ پارک، حاصل گھاٹ،

راوی اور ستلج کے درمیانی علاقے کا بیانیہ، طاہرہ اقبال کے ناول نیلی بار کا موضوع ہے۔ یہی طاؤس فقط رنگ، بھید، قصہ عاشقاں، مندری والا، میں بھی مختلف رنگوں میں نظر آتا ہے۔

معاشرتی سچائیاں اور دوزخی زندگی، یونس اوید کے ناول "کنجری کا پل" کا موضوع ہے۔ یہ طاؤس فقط رنگ، بھید، مندری والا، قلعہ جنگی میں بھی اس کے اثرات موجود ہیں۔

معاشرے میں ناانصافی اور انتشار، نعیم بیگ کے ناول "ڈیوس، علی اور دیا" کا موضوع ہے۔ طاؤس فقط رنگ، بھید، جاگنگ پارک، مندری والا، حاصل گھاٹ کے موضوعات بھی اس سے ملتے جلتے ہیں۔ تقسیم کے حوالے سے، علی اکبر ناطق کے ناول "نو لکھی کوٹھی" کا موضوع ہے اور یہ بھی اپنی طرز میں ایک ہی ناول ہے جو اس دورانیے میں منظر عام پر آیا۔ سانحہ بالاکوٹ اور معاشرے میں سماجی و ثقافتی تبدیلیاں، اختر رضا سلیمی کے ناول " جاگے ہیں خواب" کا موضوع ہے۔ حاصل گھاٹ، جاگنگ پارک، ساسا، طاؤس فقط رنگ، کئی چاند تھے سرِ آسماں، مٹی کی سانجھ میں بھی سماجی و ثقافتی عناصر کے نشانات ہیں۔ لاہور کی ادبی و ثقافتی زندگی، زاہد حسن کے ناول "قصہ عاشقاں" کا موضوع ہے۔ یہ بھی ایک منفرد موضوع ہے۔ امنِ عالم کو درپیش مسائل، صلاح الدین پرویز کے ناول " دی وار جرنلس" کا موضوع ہے۔ حاصل گھاٹ، قلعہ جنگی، منطق الطیر جدید، کنجری کا پل، جاگے ہیں خواب میں بھی اس کے ساتھ مختلف سطح پر مخاطب ہیں۔

مذکورہ بالا تمام ناولوں کے موضوعات سے "انواسی" کا موضوع مختلف ہے۔ ان میں بیان کردہ حالات میں بھی کچھ زیادہ مماثلت نہیں ہے سوائے نیلی بار کے، جس میں راوی اور ستلج کے درمیانی علاقوں کی ثقافت کو موضوع بنایا گیا ہے جبکہ انواسی کا موضوع بھی ستلج کے ساحلی علاقے کی ثقافت اور حالات کی منظر کشی پر مشتمل ہے۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ نیلی بار کا زمانہ صدر ایوب کے دور سے بھٹو کے انقلاب اور اس کی پھانسی کے وقت سے لے کر موجودہ دور تک محیط ہے جب کہ انواسی ۱۸۷۲ء سے لے کر ۱۸۷۵ء تک کے حالات پر مشتمل ہے جب انگریز برصغیر میں اپنے قدم جمانے کی کوشش کر رہے تھے، ان دونوں کے درمیان

یہ قدر مشترک ہے کہ جہاں مرد بیویوں کے سامنے ڈولیاں لوٹ کر ان کے ساتھ عیاشی کرتے تھے اور ان کو اپنی مراث سمجھ کر ان کے ساتھ خوب مزے کرتے تھے اور بیویاں بھی ان کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھاتی تھیں۔ یہ خود عیش و عشرت کی زندگی گزارتے تھے لیکن اپنی بیٹیوں کو قید کر کے رکھتے تھے اور اگر کوئی ان کے خلاف جاتا تو وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ "انواسی" جس زمانہ سے تعلق رکھتا ہے وہ ایک جہالت میں ڈوبا ہوا زمانہ تھا جب کہ نسبتاً نیلی بار کے کردار پڑھے لکھے اور سماجی طور پر آگاہ ہیں۔ منیر فیاض انواسی کے متعلق اپنی رائے پیش کرتے ہیں کہ:

> "آج جب عالمگیریت اور مابعد جدیدیت کا دور دورہ ہے اور عالمی گاؤں کی تیسری دنیا ابھی جدیدیت کے ثمرات سے بھی مستفید ہونے کی اہل نہیں ہوئی انواسی کا لوکیل اور تہذیبی شناخت کا سوال تیسری دنیا کے بنیادی انسانی مسائل کی تفہیم کے لیے نیا اور جامع تناظر مہیا کرتا ہے۔"(۲۶)

انواسی کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں ناول نگار نے ایک الگ موضوع کو اپنایا ہے جس میں ایک الگ زمانہ ہے مصنف اکیسویں صدی میں بھی انیسویں صدی کے واقعات کو زیرِ بحث لا رہا ہے مصنف نے انیسویں صدی کے حالت کو پرکھا ہے اور ان کو انواسی میں ایک خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے جس سے قاری اس وقت کے حالات سے باآسانی واقف ہو سکتا ہے جب کہ انواسی کے علاوہ لکھے جانے والے ناول ایک الگ موضوع رکھتے ہیں ان میں موجودہ دور کے حالت، دہشتگردی کے واقعات، معاشی اور معاشرتی مسائل کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

(ج) حفیظ خان کا عہد اور مقام کا تعین

محمد حفیظ خان نے تاریخ کے ایسے دور کا انتخاب کیا ہے جہاں ایک طرف ایسا زرعی معاشرہ ہے جس میں Primitive معاشرے کے انسان کی تہذیب کی باقیات دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ معاشرہ، مذہبی توہم پرستی اور قبائلی طرز کی سماجی طاقت کے زیرِ اثر ہے۔ اس معاشرے میں مذہبی اشرافیہ بھی بہت طاقتور ہے۔ دوسری طرف استعماری طاقتیں ہیں جو صنعتی قوت کے بل بوتے پر اس تہذیب کے وسائل کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاتی ہیں اور شناخت کو مٹانا چاہتی ہیں۔ انواسی ایسی جغرافیائی اور زمانی اکائی بُنتا جہاں ایک عہد دوسرے کو کچل کر آگے بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔

ادیب اور شاعر معاشرے کا ترجمان ہوتا ہے اور اس کے ماحول کو اپنی ذات میں سمیٹ ہی نہیں لیتا بلکہ وہ سارا ماحول اس کی ذات میں گھل مل کر اس کی سوچ اور اس کا ضمیر بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ سماج سے متاثر ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے تو پورا معاشرہ اپنے جذبات اپنے فلسفے اور اپنی روح کے ساتھ اس کے قلم کی روشنائی سے عیاں ہوتا ہے۔ حفیظ خان انہی خوبیوں کے ساتھ ادبی دنیا میں موجود ہیں وہ ایک صاحب اسلوب فن کار ہیں انہوں نے اپنے فن پاروں کا دائرہ تنگ اور محدود کرنے کی بجائے زندگی کے پھیلاؤ کے تناسب سے بڑھانے کی کوشش کی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات میں عصری کرب اور انسانی دکھ سمٹ کر آ گیا ہے۔

معاشرے اور ادب کا ایک دوسرے کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ ادب معاشرے کی ترقی اور نشوونما میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ادب معاشرے کی رہنمائی کا سبب بنتا ہے ادیب معاشرے کے تمام مسائل کا باریکی سے مشاہدہ کرتا ہے اور ادب تخلیق کرتا ہے۔ ادب ہی کی وجہ سے دنیا میں بڑے بڑے انقلاب رونما ہوئے اس لیے ادیب کو معاشرے میں نمایاں مقام حاصل ہے۔

ادبی درجہ بندی میں جب بھی ہم کسی ادیب یا شاعر کے مقام کا تعین کرتے ہیں تو ہمارے سامنے اس خاص عہد میں پیش آنے والی تہذیبی و سماجی تبدیلیاں اور اس کے نتیجے میں معاشرے کے کلچر سے متاثر ہونے والا وہ ذہن ہوتا ہے جو اپنے فکری و فنی رجحانات کے ذریعے اس عہد کی مخصوص تہذیب و ثقافت کی عکاسی کرتا ہے۔ ناول نگاری اپنی جامعیت کے اعتبار سے کسی تہذیب و ثقافت کی وہ تصویر پیش کرتی ہے جو کوئی اور صنف پیش کرنے سے قاصر ہے۔ تنقیدی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ضروری ہے کہ کسی ادبی مقام کا تعین کرنے کے لئے ایک طرف تو اس کی تخلیقی فکر اور تہذیبی شعور کا جائزہ لیا جائے تو دوسری طرف اس کے فنی لوازمات کا مطالعہ کیا جائے۔ حفیظ خان کا فکر و فن ناول نگاری کے مروجہ اصولوں پر پورا اترتا دکھائی دیتا ہے۔ حفیظ خان کا عہد اکیسویں صدی کے آغاز سے شروع ہوتا ہے وہ معاشرے کے ایک حساس فرد کی حیثیت سے اپنے اردگرد رونما ہونے والے واقعات و حوادث کا جائزہ لیتے ہیں۔ انہیں صدیوں پرانے ریتی رواج تہذیبی روایات سماجی و طبقاتی تقسیم منافرت عصبیت لسانی اختلافات آمریت سیاسی چالبازیاں جاگیردارانہ نظام اور مذہبی عناصر کی بالادستی ہر طرف مستحکم نظر آتی ہے۔ یہ وہ عہد ہے جب عالمی جنگوں کے بعد جغرافیائی تقسیم کا معاملہ وقوع پذیر ہو چکا تھا۔ حفیظ خان نے اپنے قلم کو بطور ہتھیار استعمال کیا اور معاشرے کے ان مسائل کے خلاف آواز اٹھائی۔

پاکستانی سماج کی اکثریتی آبادی زراعت پیشہ ہے کاشتکاروں کی اکثریت بے زمین ہے جس کی وجہ سے انہیں بطور مزارعین جاگیرداروں اور وڈیروں کی ملکیتی زمینوں پر کام کرنا پڑتا ہے۔ اس وجہ سے انہیں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہر وقت کے ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں مزارعین کے مسائل کی عکاسی کی ہے اور دیہاتی کاشتکاروں پر وڈیروں کے ظلم و ستم سے نقاب اٹھایا ہے۔ دیہی مسائل کی عکاسی کرنے والے اہم ناولوں میں اداس نسلیں، جھوک سیال، میرا گاؤں، جانگلوس، نولکھی کوٹھی، شہر مدفون اور حفیظ خان کا ناول انواسی شامل ہے۔ ناول نگاروں نے اپنی اپنی سطح پر مزدوروں کسانوں اور مزارعین کے مسائل کو پیش کیا ہے مگر حفیظ خان نے اپنے ناول میں مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ ساتھ نچلے طبقے کے کمی کمینوں سے روا رکھے جانے والے سلوک کی بھی عمدہ عکاسی کی ہے۔ چونکہ خود حفیظ خان کا تعلق زمین دار گھرانے سے ہے اس لئے ان کے ہاں تصنع یا بناوٹ نظر نہیں آتی بلکہ ان کی تحریریں ان کے عمیق تجربے اور گہرے مشاہدے کی مظہر ہیں وہ انتہائی بے باکی اور جرات مندی سے سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

حفیظ خان نے ایک طرف جہاں نو آبادیاتی کلچر کی جبری روایات اور من مانیوں کو پیش کیا تو دوسری طرف انواسی کے شکل میں یہ حقیقت بھی بیان کی ہے کہ استحصال اور جبر کا شکار یہ طبقہ اپنی حالت خود بھی نہیں بدلنا چاہتا اور نہ جانے کیوں اس ظلم اور زیادتی پر خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے۔ یہی وہ چبھتا ہوا سوال ہے جو اپنی تحریروں میں اٹھاتے ہیں۔ جاگیردارانہ سماج کا عورت ذات سے ناروا سلوک حفیظ خان کی کہانیوں کا نہایت اہم اور نمایاں موضوع ہے۔ وہ ایسی عورتوں سے بے پناہ ہمدردی رکھتے ہیں اور ان کے مسائل کو اجاگر کرتے ہیں وہ جہاں جاگیردارانہ سماج کی عورت کی حالت زار بیان کرتے ہیں وہیں وہ عام عورتوں کی بھی بات کرتے ہیں۔ ان کے ہاں کی عورت میں کمال کا گھمنڈ اور غرور ہے۔ ہمارے ہاں کے ناول نگاروں نے اپنے اپنے انداز سے عورت ذات کو پیش کیا ہے۔ مگر حفیظ خان نے عورت کو اس کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں سمیت پیش کیا ہے۔

> "مغربی کرداروں کے حالات و واقعات سے مشرقی کرداروں کی مماثلت بھی ناول میں دلچسپی اور ربط پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے اور دونوں معاشروں میں پائے جانے والی اعلیٰ انسانی قدروں کی موجودگی کو سمجھنے میں بھی معاون ثابت ہوتی ہے جبکہ ناول میں قدم قدم پر ایک ہی ہیروئن کے مقابل اس کے ہیرو کی مسلسل تبدیلی اور اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ ایک مردانہ کردار کو منظر سے یکسر غائب کر کے دوسرے مردانہ

کردار سے زیادہ نمایاں اور موثر بنا کر پیش کرنا بھی دلچسپی کا حامل ہونے کے علاوہ قدرے مشکل امر ہے جسے ممکن بنانے میں جہاں ناول کے مکالموں کی برجستہ اور برمحل زبان کا کردار نمایاں ہے وہیں مقامی اور سرائیکی زبان کے قابل فہم استعمال کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے مزید برآں یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ ناول میں فرضی کرداروں کی تعداد زیادہ ہے اور ناول نگار نے بھی کتاب کے آغاز ہی میں اسے فرضی کرداروں کے ذریعے حقیقی تناظر میں لکھا گیا ناول قرار دیا ہے لیکن اگر بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو تمام فرضی کردار ایک سچے منظر نامہ کے ساتھ اس قدر گھل مل گئے ہیں کہ اپنے تعامل سے حقیقی کرداروں سے کئی زیادہ حقیقی معلوم ہوتے ہیں"(۲۷)

سیاسی شعور د ہشتگر دی اور نائن الیون کا واقعہ ایسے موضوعات ہیں جن پر اکیسویں صدی کے تقریبا تمام لکھنے والوں نے قلم اٹھایا ہے سب نے ان مسائل پر قلم فرسائی کی ہے۔ان میں بانو قدسیہ، مستنصر حسین تارڑ، وحید احمد، نکہت حسن، عاصم بٹ، آمنہ مفتی، ڈاکٹر محمد شیراز، نیلم بشیر، خالد فتح محمد، علی اکبر ناطق کے نام نمایاں ہیں۔ مگر حفیظ خان نے ان مسائل کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا اور بین الاقوامی سیاسی چالبازیوں کو صفحہ قرطاس کی نذر کیا۔ دیہاتی طرز معاشرت تہذیب و ثقافت کی عکاسی کرنے والے چند بڑے ناموں میں پریم چند، رجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی اور منشایاد شامل ہیں۔حفیظ خان نے بھی اپنی تحریروں میں دیہی طرز زندگی اور تہذیب و تمدن کو اجاگر کیا ہے۔اس مقصد کے لئے وہ ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جو ان کرداروں کی زبان ہے۔پنجاب کا مخصوص لہجہ اور لفظیات ان کی تحریروں کے لطف کو دوچند کر دیتا ہے۔ موضوع پر بحث کرنے کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اپنے موضوعات اور فن کے اعتبار سے حفیظ خان ایک بلند مقام کے حامل ہیں۔ موضوع، مقصد، کردار نگاری، پلاٹ، مکالمہ نگاری اور تشبیہات و تمثیلات ہر اعتبار سے ان کا درجہ اعلیٰ ہے۔"انواسی" دنیائے فکشن ہی نہیں بلکہ انسانی اذہان کی تاریخ میں ایک نیا تناظر لے کر سامنے آتا ہے۔بلامبالغہ اردو ناول نگاری کی روایت میں حفیظ خان ایک رجحان ساز ناول نگار ہیں۔

حوالہ جات

1۔ راقمہ: استفسار از جاوید اختر بھٹی، بذریعہ موبائل فون، ۲۵ مئی ۲۰۲۲ء، بوقت شام ۵ بجے

2۔ حفیظ خان (انٹرویو) از عقیل حیدر، اسلام آباد، ۲۱ ستمبر ۲۰۲۰ء، بوقت بارہ بجے دن

3۔ ایضاً

4۔ ایضا

5۔ ایضاً

6۔ محمد حفیظ خان، رَت جگوں کی مراد، ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان، ۲۰۱۶ء ص ۱۹۱

7۔ حفیظ خان، (انٹرویو) از عقیل حیدر، اسلام آباد، ۲۱ جون ۲۰۲۰ء، بوقت ۱۱ بجے دن

8۔ ایضاً

9۔ ایضاً

10۔ ایضاً

11۔ الیاس میراں پوری، حفیظ خان: خان زمین زدگان، مشمولہ حفیظ خان کی تخلیقی جہتیں، مرتبہ: عصمت اللہ شاہ، ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ۲۰۱۰ء، ص ۳۴۷

12۔ ایضاً۔۔۔ص ۳۴۸۔۳۴۷

13۔ شیخ حبیب الرحمٰن بٹالوی، حفیظ خان: دھوپ میں چھاؤں جیسا، حفیظ خان کی تخلیقی جہتیں، مرتبہ: عصمت اللہ شاہ، ص ۳۶۱۔۳۶۰

14۔ رفعت عباس، پروفیسر، حفیظ خان کی تخلیقات، مظفر گڑھ کی ادبی تقریب، مشمولہ: حفیظ خان کی تخلیقی جہتیں، مرتبہ: عصمت اللہ شاہ، ص ۳۶۳

15۔ جبار مفتی، محنتوں اور عظمتوں کا نشان، مشمولہ: حفیظ خان کی تخلیقی جہتیں، مرتبہ: عصمت اللہ شاہ، ص ۱۸

16۔ مٹھل خان، یہ جو عورت ہے، مشمولہ: حفیظ خان کی تخلیقی جہتیں، مرتبہ: عصمت اللہ شاہ، ص ۸۱

17۔ مستنصر حسین تارڑ، قلعہ جنگی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۱۴۴

18۔ بانو قدسیہ، حاصل گھاٹ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۸۸۔۸۷

19۔ نکہت حسن، جاگنگ پارک، شہزاد پبلشرز، کراچی، ۲۰۱۰ء، ص ۴۰۔۳۹

20۔ ایضاً، ص ۵۳

21۔ آمنہ مفتی، آخری زمانہ، الفیصل پبلشرز، ۲۰۱۱ء، ص ۲۱۳

22۔ وحید احمد، مندری والا، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۱۶۶

23۔ محمد عاصم بٹ، بھید، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۱۰۴

24۔ نیلم بشیر احمد، طاؤس فقط رنگ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۲۶

25۔ محمد شیراز، ڈاکٹر، ساسا، عکس پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۱۶۵

26۔ منیر فیاض، عالمی افسانوی بیانیے کا اجمالی ارتقااور انواسی (مضمون) مطبوعہ: بک ڈائجسٹ (محمد حفیظ خان نمبر) لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۵۵

27۔ بی بی آمینہ، ڈاکٹر، انواسی از محمد حفیظ خان (مضمون) مطبوعہ: بک ڈائجسٹ (محمد حفیظ خان نمبر) لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۷۶

باب دوم

ناول "انواسی" کا سماجی تناظر میں تجزیہ

سماج کیا ہے؟

معاشرہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی اکٹھا رہنے کے ہیں اردو زبان میں بھی یہ لفظ مستعمل ہے۔ ہندی میں اس کے لئے سماج مستعمل ہے۔ اس کا انگریزی مترادف سوسائٹی ہے۔ سماج معاشرہ یا سوسائٹی انسانوں کے اس گروہ کو کہتے ہیں جو باہمی تعلق کے اعتبار سے انفرادی خصوصیات کا حامل ہو اس میں اقدار حیات اور ثقافت و تہذیب کے ساتھ ساتھ ذہنی، روحانی اور نظریاتی اختصاص اس طور پر موجود ہو جو اسے دیگر گروہوں سے ممتاز کرے۔ نیز جذباتی و احساساتی اور شعوری و غیر شعوری سطح پر اس کی وحدتی کڑیاں منضبط ہوں۔ ابوالاعجاز صدیقی نے سماج یا معاشرہ کی یوں تعریف کی ہے:

> "سماجی تعلقات کا وہ نظام جس میں اور جس کے ذریعے ہم زندگی گزارتے ہیں معاشرہ یا سماج کہلاتا ہے۔ سماجی تعلقات کا یہ نظام باالفاظ دیگر ہمارا سماجی ماحول، ہمارے اوہام و عقائد، افکار و تصورات، ہمارے فلسفہ حیات اور ہمارے کردار کی تشکیل و تعمیر میں بہت حد تک دخیل ہوتا ہے۔"(۱)

انسان فطری طور پر سماجی ہے اکٹھے رہ کر زندگی گزارنا اور دوسروں سے تعلق واسطہ اس کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہے یہی وجہ ہے کہ وہ گاؤں، شہر اور قصبے آباد کرتا ہے۔ اس کے قیام میں خاندان کا قبیلہ اور قوم تین اہم عناصر ہیں جو بالترتیب ماں، باپ، بہن بھائی، عزیز و اقارب اور اس سے آگے بڑھ کر رسم و رواج تاریخ فہم و فراست، سیاست اور معیشت پر مشتمل ہیں۔ معاشرے کے بغیر انسان بے معنی ہوتا ہے اور یہ انسان کو بے شمار طریقوں سے متاثر کرتا ہے جوں جوں معاشرے کی تہذیب و ثقافت میں تبدیلی رونما ہوتی ہے توں توں وہ خود بھی تبدیلی کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ جس طرح معاشرے کے بغیر انسان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اسی طرح انسان کے بغیر سماج کا کوئی شکل نہیں بن سکتی۔ انسانی رویے اور رجحانات ہی معاشرے میں تغیر و تبدل پیدا کرتے ہیں۔

انسان زندگی میں بہتری کے لیے اچھے اصول اپناتا ہے اور جس میں سب سے زیادہ عمل دخل تہذیب و ثقافت اور مذہبی روایات کو ہوتا ہے ان کی بدولت وہ سماج میں اچھی راہ پر چلنا سیکھ سکتا ہے ایمانداری، سچائی اور خلوصِ نیت سے دوسروں کے ساتھ نیکی کرنا وہ عناصر ہیں جو انسان کے کردار کو اچھا بناتے ہیں۔ سماجی شعور انسان میں آگاہی کو جنم دیتا ہے اور اس پر چلنے کی ترغیب دیتا ہے۔

> "جس طرح انسان مختلف عقائد و نظریات کا مالک ہوتا ہے اسی طرح سماج میں سانس لینے والے افراد مختلف مزاج و مذاق کے مالک ہوتے ہیں زندگی بسر کرنے کے طور طریقے انسان اور انسانی فطرت کے رائج ہونے کے طریقوں سے مختلف ہوا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی فطرت کا یہ ایک المیہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دولت اور شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے اور دوسرے انسانوں کی نظر میں طاقت کے بل بوتے پر معزز اور ممتاز کہلوانے کا خواہش مند ہوتا ہے اس طرح کے جذبوں میں سرشار سماج کے افراد نامناسب اور غیر اخلاقی عمل سے دوچار ہو جاتے ہیں۔"(۲)

ہندوستانی سماجیات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دور قدیم ہی سے ہندوستانی سماج اونچ نیچ اور ذات پات کی تقسیم میں گھرا ہوا ہے اس کی تفریق معاشی حالات یا پیشہ وارانہ ہنر مندی کے حوالے سے ہوتی ہے۔ اس سماج میں جس کے پاس زیادہ دولت ہو گی وہ اتنا ہی طاقتور اور معزز ہو گا اس کا شمار اعلیٰ طبقے میں ہونے لگتا ہے جو اقتصادی سطح پر مضبوط نہ ہو خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہب، تہذیب اور ذات سے ہو اس کا شمار نچلے طبقے میں ہوتا ہے۔ نچلے طبقے میں مزدور کسان اور غریب شامل ہیں جو محنت و مشقت سے بمشکل اپنے لئے دو وقت کی روٹی کماتے ہیں اعلیٰ طبقے سے وابستہ لوگ سماج کے کرتا دھرتا بن جاتے ہیں اس خود رو سماجی تقسیم نے ہندوستانی سماجیات میں ناہمواری کو جنم دیا۔ چھوت چھات اور اعلیٰ و ادنی کا فرق پیدا ہو گیا اس تقسیم کی تاریخ بڑی پرانی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> "ذات پات کی اس تقسیم سے معاشرتی ضرورتوں کو زیادہ اہمیت ملی۔ چنانچہ مذہبی فرائض کی انجام دہی برہمنوں کو تفویض ہوئی ملک کی حفاظت کشتریوں کے سپرد ہوئی۔ عامتہ الناس ویش کہلائے اور کاروباری اموران کے ذمہ لگائے گئے سب سے نیچ شودر تھے جن کا کام برتر طبقات کی خدمت سرانجام دینا تھا ذات پات کی تقسیم اتنی اہم

ہے کہ اس کے اثرات اور نقوش کو بیسویں صدی تجدّد بھی مٹا نہیں سکا اور برصغیر میں وطن، ذات، مذہب اور پیشے کے لحاظ سے چھوٹی چھوٹی اکائیاں آج بھی موجود ہیں"(۳)

ہندوستانی سماج جو چار طبقوں میں بٹا ہوا ہے برہمن سماج میں مذہبی امور سرانجام دیتے تھے ان کو سماج میں اعلی مقام حاصل ہوتا فوجی خدمات سرانجام دینے کے لیے راجن کا انتخاب کیا۔ ویش تجارت اور کاروباری معاملات چلاتے۔ جبکہ شودر سے آج بھی سماج میں انتہائی سطحی کام لیا جاتا ہے اس طرح ہندوستانی سماج میں ذات پات کا مسئلہ سب سے اہم ہے۔ ذات پات کی اس تقسیم سے استحصال اور خود غرضی نے جنم لیا نچلے طبقے کے لوگ اعلی طبقے کے رحم و کرم پر تھے وہ انہیں اپنا خالق محسوس کرنے لگے۔ انہیں زندگی بھر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں یہ ظلم صدیوں سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ انہیں مندروں میں داخل ہونے کی بالکل اجازت نہ تھی ایسا کرنے والے شودر کو برہمن سماج کی طرف سے اذیت ناک سزا دی جاتی اس کے علاوہ ہندوستانی سماج میں دوسری شادی کو گناہ سمجھا جاتا تھا۔ والد کے مرنے کے بعد بیوی کو بھی ساتھ ہی زندہ جلا کر ستی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو ہندوستانی معاشرہ ایک عرصے تک تہذیبی جبر اور سماجی ناانصافی کے مختلف دائروں کا قیدی رہا۔

۱۸۵۷ء کے سانحے کے بعد اردو ادب میں ایک نئے دور کی ابتداء ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ بظاہر اس حادثے کا تعلق معاشرے اور سیاست سے تھا لیکن اس کے اثرات زندگی کے تمام گوشوں پر پڑے۔ ادب کا رشتہ سماج سے بڑا گہرا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی ادیب اپنے معاشرے اور اپنے نشیب و فراز سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہر ادب اپنے عہد کے سماجی اتار چڑھاؤ سے بہر حال کسی نہ کسی شکل میں منسلک رہتا ہے۔ اس دور کی صورتحال کے بارے میں جناب علی عباس حسینی لکھتے ہیں:

"۱۸۵۷ کا غدر ہو گیا۔ یہ فوجی بغاوت میرٹھ سے شروع ہو کر چشم زدن میں جنگل کی آگ کی طرح یو۔پی بہار اور دلی میں پھیل گئی۔ بہت سے لوگ مارے گئے، ہزاروں خاندان تباہ ہوئے۔ مغل بادشاہ رنگون بھیجا گیا۔ دلی اجڑ گئی، لکھنؤ برباد ہوا، اور کلکتہ آباد۔ کمپنی کی حکومت ختم اور ملکہ کی فرمانروائی شروع ہوئی۔"(۴)

اس صورت حال نے کئی طرح سے ہندوستان کے سماج کو بدلا۔ جنگ آزادی سے قبل اردو ادب ایک مختلف ماحول سے منسلک تھا۔ شعرا اور ادیبوں کے سرپرست عام طور پر نواب اور امرا تھے۔ سہل پسندی اور عیش کوشی سماج کا لازمہ تھے۔ پرانے جاگیر داری اور نئے سرمایہ دارانہ نظام کے اثرات کا غلبہ تھا۔ چنانچہ ادب

میں بھی اس قسم کے اثرات اور عناصر دکھائی دیتے ہیں داستانیں، طویل مثنویاں اور عشق محبوب، حسن جمال سے بھرپور شاعری وغیرہ اس عہد کا نمایاں اثاثہ ہے۔ جنگ آزادی کے بعد ہندوستانی عوام کو ہمہ گیر تبدیلی سے نبرد آزما ہونا پڑا تھا۔ اس تبدیلی نے نئے مسائل اور نئے معاملات کو جنم دیا۔ جس سے نئے نئے خیالات کی راہیں کھلیں۔ جدید علوم نے لوگوں کے نظریات میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کر دیں اور ایک نیا نظام فکر و معاشرت ابھرنے لگا اور ہندوستانی ادب ایک انقلابی موڑ سے دوچار ہوا۔ محمد حسن اس بارے میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "۱۸۵۷ء کی لڑائی فکر و خیال کے طویل سلسلے کی ایک کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور چونکہ ادب بھی خیال اور جذبہ کا ہی نام ہے۔ اس لیے اس عہد کے فکری تانے بانے کو اس لڑائی نے جس طرح متاثر کیا تھا وہ ادبی مورخ کے لیے بھی دل چسپی کا موضوع ہے۔"(۵)

کسی بھی معاشرے میں قتل و خون کے حادثات، انسان کی تذلیل اور اس کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں اور ناانصافیوں کا اثر پورے معاشرے پر پڑتا ہے۔ اس کے بارے میں افضال بٹ لکھتے ہیں:

> "چنانچہ جنگ آزادی کے بعد کے حالات نے ادبی مراکز کو بھی شدید متاثر کیا دلی اجڑ چکی تھی۔ لکھنوی تہذیب و معاشرت زوال پذیر ہو چکی تھی۔ بہادر شاہ ظفر آخری مغل بادشاہ تھے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے اس دور کے حالات و تہذیب کو بڑی سفاکی سے بے آبرو ہوتے ہوئے دیکھا تھا ان کے کلام میں اس عہد کی جھلک بخوبی نظر آتی ہے۔ وقت کے بادشاہ کا پابند سلاسل ہونا اس کے بیٹوں کو بے رحمی سے قتل کرنا ان کے سروں کو بہادر شاہ کے سامنے پیش کرنا یہ تمام واقعات سفاکانہ فرنگیت کا منہ بولتا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اردو معلی اور عود ہندی کے خطوط میں بھی اس دور کے ہندوستانی سماج کی تصویر کشی کی گئی ہے۔"(۶)

ان حالات کے پیش نظر مسلمان ذہنی، عملی، سیاسی، ثقافتی، اقتصادی اور سماجی سطح پر اذیت ناکی کا شکار ہو چکے تھے ان کا صدیوں سے قائم اقتدار چھن چکا تھا۔ انگریز مسلمانوں کی طرف سے ہمیشہ بدگمان رہے۔ اس سلسلے میں مسلمانوں پر اقتصادی پابندیاں لگانے کے ساتھ ساتھ ان کی کردار کشی بھی کی جانے لگی۔ ہندوؤں نے جنگ آزادی کو مسلمانوں کا کارنامہ کہہ کر انگریزوں کی قربت حاصل کر لی اور معاشی ذرائع پر قابض ہو گئے

۔ ان کا کاروبار بھی پھیلنے لگا جبکہ مسلمان مزید معاشی اور سماجی ابتری کا شکار ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہندوستانی سماجیات میں ایک بڑی ہلچل تھی جس نے ایک طرف تو معاشی، معاشرتی اور نفسیاتی سطح پر اثرات مرتب کیے تو دوسری طرف زبان و بیان کے فروغ میں وسعت پیدا کر دی۔ اس زمانے میں انگریزی زبان و ادب نے ہندوستانی زبان و ادب پر اثرات مرتب کرنا شروع کر دیے۔ بقول ڈاکٹر سہیل بخاری:

"۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی حکومت کے استحکام کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان اور معاشرت کا اثر بھی تیز ہو گیا۔ ادیبوں اور شاعروں نے ادب کے حوالے سے قومیت، آزادی، مساوات، یگانت وغیرہ کے پیغامات عوام تک پہنچائے ادب کی بنیاد مادی حقائق اور سماجی شعور پر قائم کر دی۔ ادب نے براہ راست زندگی اور اس کے مسائل سے نبرد آزما ہو کر مستقبل کی راہیں ہموار کرنا شروع کر دیں جس سے سماج ترقی اور بہتری کی راہ پر گامزن ہو گیا۔"(۷)

یوں بھی یہ کہا جاتا ہے کہ ناول اپنے معاشرے کی تصویر کشی ہے ناول اور کہانیاں جس معاشرے میں جنم لیتی ہیں اس کے معاملات کی جھلک بھی ان میں نظر آتی ہے لکھنے والا اپنے معاشرے سے دور رہ کر کچھ نہیں لکھ سکتا۔ اس کے متعلق ناز قادری کے بقول:

"یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قصہ اور کہانی سماجی تخلیق ہے۔ اس بنیاد پر اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ داستان کی صنف اپنے عصری پسِ منظر میں قصہ گوئی کے جمالیاتی تقاضوں کی تکمیل کر رہی تھی۔ میتھیو آرنلڈ کے بقول ادب جمالیاتی سطح پر زندگی کی تنقید پیش کرتا ہے یہ نتیجہ منطقی اور فطری طور پر سامنے آتا ہے کہ داستان کی صنف اپنے عصری پسِ منظر کی آئینہ دار، ترجمان اور نقاد تھی یعنی وہ اپنے عصری سماج میں قصہ گوئی کی ضرورتوں کی باضابطہ طور پر تکمیل کرتی تھی۔ اس عہد کی سماجی زندگی کے مزاج، رجحان اور میلان کی حرف بہ حرف اور پہلو بہ پہلو ترجمانی کے لئے داستان کی صنف فنی پختگی رکھتی تھی۔ عصرِ حاضر کے ناقدین ادب نے داستان کی صنفی حیثیت میں بہت سی خامیاں تلاش کیں لیکن یہ حضرات اس حقیقت کو فراموش کر گئے کہ ادب صرف معنوی طور پر زندگی سے متعلق نہیں ہوتا بلکہ ہیئتی سطح پر بھی زندگی سے متعلق ہوتا ہے یعنی سماجی نظام کی نوعیت صنف کی ہیئت پر اثر انداز ہوتی ہے" (۸)

۱۸۵۷ء کے حادثات نے پورے ہندوستانی سماج کا رخ تبدیل کر دیا۔ ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی رونما ہونے لگی۔ انگریزوں نے جنگ پر پوری طرح قابو پالیا اور مرحلہ وار انتقامی کارروائیاں شروع کر دیں۔ ہندوستانی عوام کو سرعام قتل کیا گیا نہتے شہریوں، بچوں اور عورتوں کو بربریت کا نشانہ بنایا گیا۔ قتل وغارت اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا گیا عوام کا سیاسی اور سماجی وقار بالکل ختم ہو گیا معاشرہ ناآسودگی کی زد میں آچکا تھا۔ پوری ہندوستان کی عوام نہایت بے بس، لاچار اور بے یارومددگار شکست خوردہ قوم بن کر رہ گئی۔

قیام پاکستان سے پہلے ریاست بہاول پور کی حیثیت

تقسیم سے قبل ریاست بہاول پور کو برصغیر پاک وہند کی ان چند مسلم ریاستوں میں شمار کیا جاتا تھا جس نے اپنے بہترین نظم ونسق کی بدولت تعمیر اور ترقی کی شاندار منازل طے کیں۔ بہاول پور کے حکمرانوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے عوام کو امن و امان، عدل و انصاف، معاشرتی مساوات اور معاشی خوشحالی سے ہمکنار کرنے کی ہر ممکن سعی کی۔ ریاست بہاول پور ہر دور میں اور ہر اعتبار سے اسلامی تہذیب وتمدن کا عمدہ نمونہ تھی۔ ریاست کے باشندوں کے درمیان بلا تخصیص رنگ و نسل، مذہب اور رواداری کا رشتہ قائم تھا۔ ریاست میں دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو پوری مذہبی آزادی حاصل تھی۔ بھائی چارہ اور مذہبی رواداری کا ایسا لازوال رشتہ قائم تھا کہ جہاں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان تعصب تو دور کی بات ہے ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان جو رواداری دیکھنے میں آتی تھی، وہ بھی اپنی مثال آپ تھی۔

ریاست کی تعمیر وترقی میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا زندگی کے ہر شعبہ میں مسلم وغیر مسلم اکھٹے کام کرتے نظر آتے، تعلیمی ادارے ہوں یا دفاتر، نجی محفلیں ہوں یا تہوار، مسلم اور غیر مسلم سب اکھٹے نظر آئے۔ ریاست جس طرح مسلمان ملازمین کو حج کے موقع پر چھٹی اور پیشگی تنخواہ ادیتی اسی طرح ہندوؤں اور سکھوں کو بھی ان کے تہواروں کے موقع پر چھٹی اور پیشگی تنخواہ دیتی۔ جمعہ کی نماز ہو یا عید کی نماز سب لوگ شاہی خطیب قاضی عظیم الدینؒ کی امامت میں ادا کرتے۔

اگر کوئی مذہبی مسئلہ پیش آتا تو اس کے حل کے لیے تمام علماء کا متفقہ اجلاس بند کمرے میں منعقد کیا جاتا اور جس بات پر سب متفق ہوتے اسے قانون کا درجہ دے دیا تھا۔ دراصل یہی وہ اعلیٰ و برتر مقاصد تھے جن کی بجا آواری نے ریاست بہاول پور کو فلاحی اور رفاہی مملکت کے تصور سے ہم آہنگ کرنے میں ہر ممکنہ معاونت فراہم کی۔ یہاں یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ برصغیر میں مسلم روایت واقدار کے امین کی حیثیت سے جو مرتبہ نظام آف دکن کی سلطنت عثمانیہ کو حاصل رہا وہی مقام عباسیوں کی ریاست بہاول پور کو حاصل تھا۔ یہاں ایک واضح فرق ہے کہ غیر ملکی استعمار کا سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی حیدر آباد کا سقوط تو ہندوستان میں مسلمانوں کی بچی کچھی عظمت وشان کا اعلامیہ ثابت ہوا۔ لیکن اس کے برعکس ریاست بہاول پور کے الحاق سے نوزائید اسلامی مملکت پاکستان کو اپنی جغرافیائی سالمیت اور انتظامی وحدت کو برقرار رکھنے میں مدد ملی۔

اگر درج بالا حقائق کو مد نظر رکھ کر سوچیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ برصغیر میں اس وقت ایک خطہ ایسا ضرور موجود تھا جو نظریہ پاکستان کے تقاضے پورے کر رہا تھا یعنی مشرقی اقدار و تہذیب ،اُردو کی ترویج واشاعت اور اسے سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہونا وغیرہ اس کے علاوہ اس خطے میں ایک ایسی مکمل اسلامی ریاست موجود تھی جو دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو اسلام کے اصولوں کے عین مطابق پوری مذہبی آزادی دیتی تھی۔

ان کا ۳۱ سالہ دور حکومت متنوع خصوصیات کا حامل ہے۔ ان کے دور میں ریاست نے بے پناہ ترقی کی۔ نواب صادق محمد خان خامس ایک ذہین اور قابل نواب تھے۔ انہوں نے حالات حاضر کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے ہر محکمہ کے لیے روز گار زمانہ افسران تعینات کیے۔ ان کے دور کا سب سے بڑا کارنامہ ''ستلج ویلی پراجیکٹ''عظیم آبپاشی کے منصوبے کی تعمیر و تکمیل (۱۹۲۲ تا ۱۹۳۳) ہے ریاست بہاول پور کے یہ آخری نواب نظم و نسق کے نقطہ نظر سے انتہائی سخت گیر تھے۔ اس سلسلے میں وہ اپنی اولاد کو بھی فاصلے پر رکھتے تھے۔ وہ انتظامی معاملات میں کسی قسم کی ابتری یا بد عنوانی کو برداشت نہ کرتے تھے۔ ریاست کے دفاتر اور انتظامی شعبوں کا اچانک معائنہ کرتے اور کسی کی خامی یا بے قاعدگی کی سختی سے باز پرس کرتے۔

"بعض اوقات وہ اپنی مشہور زمانہ چھڑی (فیض علی) سے کام لینے سے بھی
دریغ نہ کرتے۔"(۹)

انہوں نے اپنی ریاست میں جمہوری طریقہ متعارف کرایا۔ اپریل ۱۹۴۳ء میں ڈسٹرکٹ و میونسپل بورڈ کے انتخابات ہوئے ان کے ارکان نے ریاستی اسمبلی کے ممبران کو منتخب کیا۔ پانچ رکنی کابینہ تشکیل دی گئی۔ نواب صادق محمد خان خامس نے اپنی ریاست میں تعلیمی اداروں کا جال بچھا دیا۔ لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کے لیے بھی جدید تعلیم کا انتظام کیا۔ انہوں نے ۱۹۲۵ء میں جامعہ عباسیہ (موجودہ اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور) کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے صادق وومن کالج (موجودہ صادق یونیورسٹی) اور ایچی سن کالج کی طرز پر صادق پبلک سکول تعمیر کرایا جس کے لیے نواب صادق نے امداد کے علاوہ اپنا ذاتی ۴۵۰ ایکڑ رقبہ فراہم کیا۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے دیگر شعبوں میں خدمات سر انجام دیں انہوں نے بہاول پور چڑیا گھر اور ڈرنگ سٹیڈیم کے نام سے ہاکی کا میدان بنوایا۔

۲۴ مارچ ۱۹۲۵ء کو نواب صادق خان خامس نے صادق ریڈنگ لائبریری (موجودہ سنٹرل لائبریری) کا سنگ بنیاد رکھا۔ نواب صادق محمد خان خامس کی سرپرستی میں عزیز الرحمٰن عزیز نے پہلی بار سرائیکی کے قادر کلام صوفی شاعر حضرت غلام فرید کا کلام دیوانِ فرید ترجمہ و تشریح کے ساتھ مرتب کیا جو کہ ۱۹۴۲ء میں عزیز المطابع پریس سے شائع ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں بہاول پور وکٹوریہ ہسپتال کی توسیع کرائی۔ الغرض زندگی کے ہر شعبہ میں انہوں نے خدمات سر انجام دیں۔ یہ صرف چیدہ چیدہ کام ہیں یقیناً ان کے کارناموں کی فہرست طویل ہے جس کی تفصیل طوالت کے خوف سے نہیں دی جارہی۔

نواب صادق محمد خان خامس کے دور حکومت کا ایک اہم کارنامہ ریاست کا پاکستان سے الحاق تھا۔ نواب نے اپنے ذاتی مفاد کو عوامی مفاد کی راہ میں حائل نہ ہونے دیا اور ریاست کے عوام کی مرضی کے مطابق نہ صرف نوزائید ملک پاکستان سے الحاق کیا بلکہ اس کی ہر طرح سے امداد کر کے اس نوزائیدہ ملک کو آکسیجن ماسک فراہم کیا۔ نواب صادق محمد خان خامس کی پاکستان کے لیے خدمات کو دیکھتے ہوئے قائداعظم محمد علی جناح نے نواب صادق محمد خامس کو محسن پاکستان کا خطاب دیا۔ نواب صادق محمد خان خامس کا دور

حکومت ۱۹۲۴ء سے ۱۹۵۵ء تک رہااور ون یونٹ کے قیام کے بعد نواب صاحب لندن چلے گئے اور باقی عمر وہاں گزاری۔

''نواب صادق محمد خان خامس محسن پاکستان ریاست کے آخری نواب عوام کے محسن لیڈر ۲۴ مئی ۱۹۶۶ء کو لندن میں اپنی رہائش گاہ سروے کاؤنٹی میں وفات پاگئے۔'' (۱۰)

ان کی وفات پر ہر آنکھ اشکبار اور ہر دل غمگین تھا۔ان کے جسد خاکی کو بہاولپور لایا گیا۔ڈیرہ نواب صاحب کی عید گاہ میں خطیب ریاست قاضی عظیم الدینؒ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ نماز جنازہ میں آٹھ لاکھ سے زائد افراد نے شرکت کی۔

تقسیم سے قبل ریاست بہاول پور کی معاشی صورتحال

ریاست بہاول پور کو برصغیر کی دوسری بڑی امیر ترین ریاست کا درجہ حاصل تھا۔جو کہ ہر لحاظ سے خود مختار اور خود کفیل تھی۔ ستلج ویلی پراجیکٹ کی بدولت بہاول پور خوشحال اور زرخیز زمین کی حامل ریاست تھی جس کی خوشحالی کی کشش ہی دوسرے علاقے کے لوگوں کو یہاں آنے پر مجبور کرتی تھی۔

ریاست بہاول پور کی معاشی خوشحالی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ستلج ویلی پراجیکٹ کی تعمیر کے لیے ریاست نے حکومت ہند (برطانوی ہند) سے ۱۲ کروڑ دس لاکھ چورانوے ہزار سات سو اٹھتر روپے قرض لیا۔ جس کی ادائیگی ۵۰ سالوں کے دوران ہونا تھی۔اس قرض پر سود کی شرح ۴٪ تھی۔واجب الاادا قرض اور سود کی رقم ۲۷ کروڑ تک جا پہنچی تھی مارچ ۱۹۳۶ء سے قرض کی ادائیگی کا آغاز ہوا،اور مارچ ۱۹۸۶ء کو اس کی آخری قسط اداہونا تھی۔

''مگر ریاست بہاول پور نے یہ قرض ادائیگی کی تاریخ سے ۳۶ سال قبل جنوری ۱۹۵۰ء میں ادا کر دیا۔'' (۱۱)

ریاست بہاول پور کا محکمہ حساب و خزانہ تمام آمدنی و خرچ کا ریکارڈ، جمع شدہ نقدی، سونا، چاندی اور دیگر قیمتی اشیا کی حفاظت کرتا تھا۔ریاست بہاول ہر طرح سے ایک خوشحال ریاست تھی۔ قیام پاکستان سے برصغیر کا سب سے بڑا نہری نظام بھی یہیں تھااور برصغیر کے تمام بڑے تعلیمی اداروں کو عطیات بھی یہاں سے بھیجے جاتے

تھے۔ان اداروں میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایچی سن کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی لاہور جیسے ادارے بھی شامل تھے۔یہ سلسلہ صرف تعلیمی اداروں تک محدود نہیں تھا بلکہ ہسپتال،لائبریریاں اور اہم شخصیات بھی ان عطیات کا حقدار قرار پاتی تھیں۔ریاست کے اندر بہاول پور وکٹوریہ ہسپتال اس وقت برصغیر کے چند بڑے ہسپتالوں میں شمار ہوتا تھا۔ایس ای کالج ،جامعہ اسلامیہ اور صادق پبلک سکول کا نام آج کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ریاست بہاول پور کی معاشی خوشحالی کا ایک منہ بولتا ثبوت یہ بھی ہے کہ نواب آف بہاول پور کئی اداروں اور افراد کو عطیات اور ان کی امداد کرتے تھے یہاں تک کہ وہ انگریز سرکار کو بھی امداد دیتے تھے۔

ریاست کے ہر علاقے میں کالونی سکول، تحصیل اور ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال،اسٹیڈیم، بجلی کا نظام، ریلوے لائن اور تھانے بہاول پور بینک غرض نظام ہائے مملکت کا ہر ضروری جزو موجود تھا۔صنعتی حوالے سے اس دور میں یہاں بڑے بڑے کارخانے موجود تھے۔نواب آف بہاول پور کے وژن کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ تقریباً سوا سو سال پہلے یہاں سے ریلوے لائن گزاری گئی تو کچھ عرصے بعد ہی خانپور سے ایک ریلوے لائن چاچڑاں تک بچھادی گئی جو دریائے سندھ کے کنارے واقع ایک قصبہ ہے۔

ریاست بہاول پور کی معاشی خوشحالی کا ایک منہ بولتا ثبوت یہ بھی ہے کہ نواب آف بہاول پور کئی اداروں اور افراد کو عطیات اور انکی امداد کرتے تھے یہاں تک وہ انگریز سرکار کو بھی امداد دیتے تھے۔

(الف)انگریزی تسلط کے بہاول پور کے سماج پر اثرات

حفیظ خان نے ناول انواسی میں انگریزوں کے ظلم اور جبر کا ذکر کیا ہے کہ وہ کس طرح بہاول پور کے لوگوں پر مسلط تھے اور لوگ اُن کی طاقت سے خوف کھاتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے وہاں کے لوگوں کو تو اپنا غلام بنا رکھا تھا اور ان پر حکمرانی کر رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی وہ لوگ بہاول پور کی ایک بستی آدم واہن میں جہاں پر ایک قبرستان تھا انگریز اس کو بھی ختم کرنا چاہتے تھے جہاں پر ان کے بزرگ دفن تھے اور ان کی ہڈیاں اس مٹی میں رچی ہوئی تھیں۔انگریز اس بستی کے قبرستان سے جنات کی بگھی(ریلوے ٹریک) گزارنا چاہتا تھا جو کہ اس علاقے کے لوگوں کے لیے ایک اذیت سے کم نہیں تھا اور وہ اس انگریز قوم کے ارادے کے خلاف مَر مٹنے کے لیے تیار تھے۔مصنف اس بارے لکھتے ہیں:

"اتنا ضروری تھا کہ یہاں کی رعیت نما مخلوق مسلسل حیرت میں تھی کہ اس قدر لوہا زمین پر کس واسطے بچھایا جارہا ہے اور یہ اتنے بڑے بڑے کوٹھے کس جناتی طاقت سے زمین پر دوڑیں گے۔"(۱۲)

جب انیسویں صدی میں ریلوے نظام شروع ہوا تو انگریزوں نے بہاول پور کی بستی "آدم واہن" کے ایک پرانے قبرستان میں سے ریلوے لائن گزارنے کا فیصلہ کیا جس پر مسلمان لوگ کسی صورت آمادہ نہیں تھے اور وہ انگریز کے خلاف ہر صورت میں کھڑے ہونے کے لیے تیار تھے، جب کہ ان لوگوں کہ زندگی کوئی خاص نہیں تھی اور نہ ہی یہ لوگ حکومتِ وقت اور انگریز کے خلاف جاسکتے تھے لیکن اس وقت مسئلہ ان کے جذبات کا تھا اور مذہبی اقدار بھی شامل تھیں کہ وہ اپنے مُردوں کو دوبارہ نہیں اکھاڑنا چاہتے تھے۔ جب کہ ہندوؤں کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا اور نہ ہی وہ اس پلان کے خلاف تھے کیوں کہ انہوں نے تو مردوں کو دفنانا ہی نہیں ہوتا تھا اس لیے انہیں ریلوے لائن بچھائے جانے سے کوئی پریشانی نہیں تھی اور وہ انگریزوں کے حق میں تھے حالانکہ ان کی مذہبی حالت بھی کچھ زیادہ بہتر نہ تھی۔

انگریز مسلمانوں کے جذبات کو اور ان کی مذہبی اقدار کو ٹھیس پہچانا چاہتے تھے۔ جو ملتان اور ریاست بہاول پور کے درمیان دریا کے کنارے آباد تھے جن پر انگریز مسلط تھے اور پوری طرح کی حکمرانی ان کی تھی بستی کے لوگوں کی زندگی محض ایک انسان نما انسان کی زندگی تھی لیکن انگریز ان کو انسان کا درجہ نہیں دیتا تھا۔ ان لوگوں کی زندگی محض پیٹ پالنے کی حد تک محدود تھی وہ بس دو وقت کی روٹی کو ہی اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے تھے اور اس پر بہت خوش تھے۔ اور دریا ہی ان لوگوں کا ذریعہ معاش تھا جس میں سے وہ مچھلی کا شکار کر کے اپنی خوراک پوری کرتے تھے۔

ان لوگوں میں دو طرح کے جرائم تھے رسہ گیری (چوری کرنا) اور بازو نکالنا (لڑکی اغواہ کرنا) اور مویشی دریائی بستیوں کی معیشت کی بنیادی اکائی سمجھے جاتے اور اغواہ ہو جانا کوئی خاص جرم نہیں سمجھا جاتا تھا جس پر جاگیر دار اور زمیندار اپنی مرضی سے لڑکیوں کو اغواہ کرتے جس پر کوئی آواز نہ اٹھاتا۔ یہ معاشرہ لڑکیوں کے اغواہ ہو جانے پر تحفظ فراہم کرنے میں ناکام تھا جس پر وہ لڑکیوں کا جلد نکاح یا منگنی کر دیتے اور اس ذمہ داری سے آزاد ہوتے۔ اس میں معاشرے کو بے نقاب کیا گیا ہے جس میں عورت بھی کسی کے ساتھ

بھاگ جانے یا اغواہو جانے کو کوئی بُرا فعل تصور نہیں کرتی کیوں کہ یہ سب اس معاشرے کا حصہ بن چُکا ہے اور غیرت نیلام ہوتی نظر آرہی ہے۔

انگریزی تسلط میں وہاں کی رعایا بے شمار مظالم کے ساتھ ساتھ عدم تحفظ کا بھی شکار تھی۔ آئے دن انہیں مختلف طرح کی صورت حال سے نبرد آزما ہونا پڑتا اس طرح ان کے اندر ایک عجیب طرح کا خوف گھر کر گیا اور وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے۔ اور اگر جب کبھی کسی کو اس بات پر بہت زیادہ تشویش ہوتی تو وہ شکایت کرنے جاتا تو اس کی سنی نہ جاتی اور نہ انہیں اپنے استحصال پر احتجاج کا حق تھا۔ ایسا صرف ان کے ساتھ نہیں ہونے والا تھا بلکہ ایسے کئی واقعات پہلے بھی حکومت کی جانب سے کیے جا چکے تھے لیکن کسی بھی حملے میں رعایا کو ہی نقصان کا سامنا کرنا پڑتا بس اسی بات کا ڈر انہیں لگا رہتا کہ اس بار بھی کسی بہت بڑے نقصان کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے۔ دوسری جانب مقامی لوگوں کی بزدلی کا یہ حال تھا کہ وہ خطرے کی صورت میں اس کا مقابلہ کرنے کی بجائے فرار کو ترجیح دیتے تھے۔ ناول سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "رات کے ایک بجے جب گورا فوج نے چاروں طرف سے بستی کو گھیر اڈالا تو سیدے کے صرف پانچ چھ ساتھی قبرستان کی بیرونی سمت اپنی اپنی جگہ بیٹھے اونگھ رہے تھے۔"(۱۳)

جب بھی کسی معاشرے کی بات آتی ہے تو سب سے پہلے اس کی پہچان وہاں بسنے والے لوگوں کے رسم و رواج اور ان کی مروجہ روایات کی نشاندہی سے اس معاشرے کے بارے میں مکمل آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ کوئی بھی معاشرہ اس وقت تک مکمل معاشرہ نہیں کہلا سکتا جب تک اس کے باسی ان روایات کی پاسداری اپنا فرض نہیں سمجھتے۔ ناول انوا سی میں بھی جس معاشرے کو پیش کیا گیا ہے اس میں ان رسم و رواج جو انگریز یہاں کے لوگوں پر مسلط کر گیا تھا اپنی پوری آب و تاب سے رواں دواں نظر آتے ہیں اور اسی بات کی نشاندہی جان برٹن ان الفاظ میں کی ہے: "جان برٹن یہ بھی جانتا تھا کہ مسئلہ معاشی یا انتظامی سے زیادہ لوگوں کی جذباتی وابستگی کا تھا۔"(۱۴)

کشتویوں کا پتن بستی کی معیشت کے لیے ناگزیر تھا اور انگریز اپنے تجارتی مفادات کی لالچ میں اس کی اس اہمیت کی طرف توجہ نہیں دے رہے تھے۔ پتن کی نہ صرف گاؤں کے لوگوں کے لیے اقتصادی اہمیت تھی بلکہ وہ ان کی سماجی زندگی کا حصہ بن چکا تھا۔ ناول مین جابجا اس ذہنیت کا ذکر ملتا ہے جو انسانوں کو انسان

سمجھنے سے انکاری ہے اور انہیں درجہ انسانیت سے نیچے سمجھنے کی عادی ہے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ:"دریا کے دونوں کناروں پر پلنے والے انسان نما کیڑے مکوڑوں کی خبر کون لیتا ہے"[۱۵]

جن کے لیے زندگی کی سب سے بڑی مہم جوئی پیٹ سے شروع ہوتی ہے اور پیٹ پر ہی ختم ہوتی ہے اس باقی دورانیے میں باقی جو کچھ بھی تھا یا ہوتا رہتا وہ محض سانسوں کا آنا جانا ہی گردانا جاتا ہے۔ انہیں پیٹ پالنے سے فرصت ہی نہیں ملنے دی جاتی کہ وہ اس سے آگے کچھ سوچ سکیں۔ اور دریاؤں کے کنارے آباد بستیوں میں دو طرح کے جرائم اتنی کثرت سے ہوتے ہیں کہ اپنی حساسیت کھو بیٹھتے ہیں۔ اُن بہتات کے سبب انہیں سماجی معمولات کا جزو سمجھ لیے جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ ان میں سرِ فہرست رسہ گیری یعنی مال مویشی کی چوری اور بازو نکالنا یعنی جوان عورتوں کا اکثر بالرضا اور کبھی کبھار انہیں جبراً بھگا لیا جانا۔ اور اس سے بھی آگے یہ کہ مال مویشی چونکہ دریائی بستیوں کی معیشت کی بنیادی اکائی سمجھے جاتے تھے اس لئے معاشرتی اکائی یعنی بازو کا اغواء ہو جانا اتنا کاری وار نہیں گردانا جاتا جتنا کہ گائے بھینس کا چوری ہو جانا۔ اس قبیح فعل کو ایک سماجی حقیقت کے طور پر قبول کر لیا گیا تھا۔ جب کوئی معاشرہ احساس کمتری کا شکار ہو جائے تو اس کے اندر اس طرح کی چیزوں کا ہونا عام سی بات ہے اور یہی کچھ بہاولپور کے عوام کے ساتھ ہوا جو کہ انگریزی تسلط کا نتیجہ تھا۔ اس تسلط کو مصنف نے بڑے احسن طریقے سے بیان کیا ہے۔:

> " دیگر دریائی بستیوں کے ساکنان کی طرح آدم واہن کے باسیوں کو یقین تھا کہ جس طرح بڑے بڑے زرخیز تھنوں والی چٹی گوری لڑکیاں اغواء ہو کر ہی رہتی ہیں اُسی طرح لشکارے مارتی بھینسیں اور دودھ سے بھرے تھنوں والی گائیں بھی پرایا دھن ہی ہوتی ہیں"۔[۱۶]

اسی طرح پوہ کی سردیوں میں صاحب بہادروں کے خیموں کے اطراف میں جنگلات سے کاٹی گئی لکڑیاں رات بھر جلائی جاتی رہتیں تاکہ سردی ان کے معمولات پر اثر انداز نہ ہو۔ آگ کے تسلسل کو باقی رکھنے اور اس کی تپش پر ارد گرد سے اکٹھے ہو جانے والے جانوروں کو بھگانے کے واسطے پہریداروں کی نگرانی کا انتظام ہوتا تھا جو کہ ظاہر ہے مقامی ہوتے تھے اور اس انتظام کا ذمہ بستی کے مقامی مزدور نما لوگوں نے اُٹھا رکھا تھا جو نہایت کم معاوضہ پر انگریزوں کے لئے اپنی خدمات سرانجام دیتے تھے۔ یہ اس دہرے رویے کا مظہر ہے جو اس نو آبادیاتی سماجی بندوبست کی روح تھا کہ گوروں کو تو کوئی بے آرامی نہ ہو اور مقامیوں کا خدا حافظ۔

ناول کے بیانیے میں جابجا اس زمانے کے حالات وواقعات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ مثلاً یہ کہ دریائے ستلج کے آدم واہن پتن کے جنوبی کنارے پر ہی انڈس ویلی ریلوے کمپنی کے عملے کے کیمپ تھے جن میں شام ہوتے ہی مٹی کے تیل سے جلنے والے لیمپ روشن ہو جاتے تھے۔ نباتاتی تیل یا حیوانی چربی سے جلنے والے چراغوں کی روشنی اِن کے مقابل ادنیٰ ہونے کے سبب محض ٹمٹماتی یا تھرتھراتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ پیرافین یا کیروسین لیمپ کہلائے جانے والے یہ روشنی کے ہنڈے ریلوے کمپنی میں کام کرنے والے مقامی لوگوں کے لئے نئے اور ان دیکھے ہونے کے سبب حیرت کا جہان تھے۔ ان کے تئیں وہ رات کو دن بنا دینے والے شیشے کے گھڑونچے جادوئی چراغ تھے جن سے وابستہ ہو چکی مفروضہ داستانیں اب اتنی بھی حیران کن نہیں رہی تھیں۔

ناول میں حفیظ خان نے ایک ایسا کردار تخلیق کیا ہے جو اس معاشرے کے تمام تر معاملات کو بیان کرتا ہے۔ سیدا ایک ایسا شخص ہے جو عورت کو محبت تو کرتا ہے لیکن وہ اس کے رویے کے خلاف احتجاج بھی کرتا ہے۔ وہ اس سے اپنی نفرت کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے "اور اُس نے جو دو بار میرے منہ پر تھوکا ہے، ایک بار جو تامارا ہے تو کیا کوئی عورت اپنے سر کے سائیں سے بھی ایسا برتاؤ کرتی ہے۔"(۱۷)

اس کے نزدیک کسی عورت کو اس کی مرضی کے خلاف اٹھالینا کوئی جرم نہیں تھا۔ سیدے نے سنگری کو اغوا کرنا تمام مسائل کا حل سمجھا اور اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا اور اسے ایک بار بھی ایسا نہیں لگا کہ اس نے سنگری کو اغوا کر کہ کوئی جرم کیا ہے یا کوئی غلطی کی ہے اور ہندوستانی معاشرے کے لیے یہ کوئی نئی بات بھی نہیں تھی۔ اس کے بارے میں فہمیدہ کبیر رقمطراز ہیں:

> "ہمارا قومی مزاج اسی قسم کا واقع ہوا ہے کہ ہم عورتوں پر حکمرانی کرنے کو کو اپنا حق لازمی سمجھتے ہیں اور ہم نے ہر ایک گھر میں اس قاعدے کو اسے عام طور پر برتے جاتے دیکھا ہے کہ جہاں کہیں اس کے توڑنے کا نام لیا جاتا ہے وہیں فساد ہوتا ہے"(۱۸)

حفیظ خان نے اس ناول میں ایسے بہت کم کردار پیش کیے ہیں جو مسلسل ایک ہی رویے کے حامل ہوں۔ اس معاشرے کا مرد عورت پر اپنا ہر حق جتاتا نظر آتا ہے اور اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کے اس حق کے پیچھے عورت کی کیا مرضی ہے۔ مرد سمجھتا ہے کہ عورت تو احساسات سے عاری ہے اور اسے کوئی حق نہیں کہ وہ مرد کی مرضی کے سامنے اپنی مرضی کا اظہار کرے یا اسے کسی بات سے منع

کرے۔ عورت کو تو صرف مرد کی مرضی پر اپنا سر جھکانا ہے چاہے وہ جس بھی صورت میں ہو اس کا تعلق معاشرتی عوامل سے ہو یا ذاتی معاملات ہوں۔ حفیظ خان نے اس ناول میں مذکورہ معاشرے کی نبازی کو بڑی چابکدستی سے بیان کیا ہے جو کہ اس اقتباس سے عیاں ہے۔ مصنف لکھتے ہیں۔ "روتی کیوں ہے کملی! تیری تو آج سہاگ رات ہے کوئی زنا تھوڑا ہے جو حق میں ہو اس کا کیا رونا۔"(۱۹)

وہ اس زبردستی کو بھی اپنا حق سمجھتا تھا اور اس پر شرمندہ بھی نہیں تھا۔ اس سب کے بعد وہ ان الفاظ میں اپنی نفرت کا اظہار کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ اپنا حق وصول کرنے کے بعد میں نے تمہیں دے دینی ہے طلاق اور یہاں سے چلے جانا ہے تیرا میرا رشتہ تو ختم ہاں میرے جانے کے بعد جو یہاں اس ڈیرے پر پندرہ بیس مُشٹنڈے ہیں وہ جو تم سے پُل بندی کی صورت کریں گے اسے ضرور زنا کہتے ہیں۔ اس کی یہ انتقامی سوچ اور دوغلا پن اتنا مضبوط تھا کہ وہ اس سے مرنے کے بعد بھی وابستہ رہنا چاہتا تھا۔ یہ انتقامی سوچ اس پورے معاشرے کی عکاس ہے اور یہ رویہ ایسے معاشرے میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ حفیظ خان نے ناول میں ایسے رویوں کو بار بار بیان کیا ہے کیوں کہ انگریزی تسلط نے اس پورے خطے کے انسانوں کی سوچ کو محدود کر دیا اور اسے اپنے مفادات کی غرض سے انسانیت کے اوصاف سے بھی گرا دیا۔ ناول میں ایک جگہ مصنف لکھتے ہیں کہ: "میں بچ گیا تو اپنا اُدھار وصول کروں گا اور اگر مارا گیا تو قبر سے آکر تجھے گبھن کروں گا۔"(۲۰)

یہ اس کی منتقم مزاجی کا واضح ثبوت تھا۔ اس کے انتقامی ذہن اور اس میں پنپنے والی بدلے کی آگ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے کتنی دیر اس بات کا انتظار کیا اور اپنا دوغلہ رویہ اسے دکھاتا رہا۔ اس سے سنگری کو کبھی اس بات کی خبر ہی نہ ہونے دی کہ وہ اندر ہی اندر اس کے بارے میں کیا سوچتا ہے اور اس کے اور اپنے تعلق کا کتنا برا اختتام کرنے والا ہے جیسا کہ مصنف لکھتے ہیں: "تو نے میرے منہ پر تھوکا اور میں نے تیری کوکھ میں حساب برابر۔"(۲۱)

رقابت اور سماج میں عمومی طور پر پائے جانے والی غیرت کی وجہ سے سیدے نے سنگری کو اغواء کر لیا تاکہ کوئی اور اس تک رسائی نہ پا سکے۔ اس ناول میں ایسے کردار بھی ملتے ہیں جو عورت کو ایک فضول شے گردانتے ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ سیدے جیسے کردار سے عورت کی اہمیت کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ سیدے نے سنگری کو جس غرض سے اغوا کیا تھا اس سے اس کی ذہنی حالت اور سوچ کا مکمل پتہ چلتا

ہے اور مصنف نے بڑی چابکدستی سے اس حالت کو بیان کیا ہے۔ جیسا کہ اس اقتباس میں مصنف لکھتے ہیں ۔"سیدے کی واپسی ہوئی تو اس نے ایک ہاتھ پاؤں اور منہ بندھے نسوانی وجود کو کندھے پر ڈالا ہوا تھا۔"(۲۲)

اسی تصور غیرت کی ایک شکل یہ تھی کہ سنگری نے سیدے کو غیرت دلاتے ہوئے کہا کہ اسے یوں اغوا کر کے کسی کے ڈیرے پر رکھنا بھی بے غیرتی ہے۔ اس سے ہمیں اس معاشرے میں رائج رسوم ورواج کا ادراک ہوتا ہے۔

> "آدم واہن والوں نے یہ کیسا ہیجڑا جنا کہ جو اپنی عورت کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے زبردستی دوسروں کے ڈیرے پر لے آیا ہے۔"(۲۳)

انگریز کے تسلط نے ایک مسلم معاشرے کے تمام تر اصول وضوابط کو پاش پاش کر دیا اور ایسے رواج ترتیب دیے جس سے ایک مسلم معاشرے کے لوگوں کے سر شرم سے جھک جائیں جیسا کہ سیدے کے کردار سے ہمیں نظر آتا ہے کہ کس طرح سے اس بات کو آسانی کے ساتھ تسلیم کر لیتا ہے کہ ایک مرد اپنی ہی عورت کو کسی کے گھر لے جا کر کسی دوسرے کے بستر پر پیش کرتا ہے اور اسے اپنی مردانی اور فخر گردانتا ہے اور لوگوں کو بتانا بھی اسے معیوب نہیں لگتا۔ اس ناول کے اندر ایسی کئی اور مثالیں موجود ہیں جن کے ذریعے سے مصنف نے اس معاشرے کی اصل تصویر کشی کی ہے جو ہمیں پہلے بھی نظر آتی ہیں۔ یوسف سرمست اس کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح سے کرتے ہیں:

> "ہندوستان میں بھی ساری دنیا کی اس فضا کا اثر پڑا اور یہاں بھی مختلف متضاد اور متصادم حالات وخیالات رہے یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کا پہلا نصف حصہ سیاسی معاشی اور سماجی حیثیت سے ہندوستان میں بڑے ہیجان و انقلاب کا زمانہ رہا ہے۔ اس ہیجان و انقلاب کے اثرات اردو ناول میں بھی جھلکتے ہیں لیکن یہاں اس بات کا ذکر بے جا نہ ہو گا کہ ادیب یا ناول نگار اپنے تجربہ اور زندگی کا وہ جو مجموعی تصور رکھتا ہے اس کو پیش کرتا ہے مگر یہ سمجھنا غلط ہو گا کہ وہ پوری زندگی کو پیش کرتا ہے یا اپنے عہد کی مکمل عکاسی کرتا ہے"(۲۴)

ان حالات کے پیشِ نظر لکھے گئے ناولوں میں سیاسی، سماجی اور ثقافتی موضوعات کے ساتھ ساتھ نفسیاتی موضوعات کو بھی برتا گیا ہے۔ عائلی زندگی کے مسائل، بے سکونی، غربت و افلاس، جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارنہ نظام ناولوں کا موضوع بنے ہیں۔

(ب) مذہبی اجارہ داری کے سماج پر اثرات

بستی کی حقیقی صورتِ حال اور سرکاری اعداد و شمار میں فرق اس غلط بیانی اور دھوکے بازی کو ظاہر کرتی تھی جو ولایتی حکمرانوں نے غریب بستی والوں پر مسلط کیا ہوا تھا۔ لوگ اس ظلم کو محسوس تو کر سکتے تھے لیکن اس کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتے تھے لہٰذا اس نے ان کے درمیان بد شگونی اور بد قسمتی کی باتوں کو بڑھاوا دینا شروع کر دیا۔ لوگ مذہبی اقدار کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور مذہبی رہنماؤں کے لیے ان کے دلوں میں بہت قدر تھی پر مذہبی رہنما ان لوگوں کی معصومیت اور جہالت سے بھرپور فائدہ اٹھاتے۔ جس کی مثال ہمیں ناول میں سنگری کے کردار سے واضح ہو جاتی ہے جس کو دیکھتے ہی مولوی کی نیت بدل جاتی ہے اور سنگری اور سیدے کے نکاح پر بھی فتویٰ جاری کر دیا تھا کہ بچپن کا نکاح کوئی نکاح نہیں ہوتا اور جب سنگری نے مولوی کو خود سے نکاح کرنے کو کہا تو مولوی کچھ ششو پنج میں تھا لیکن پھر اس کے ذہن میں ایک خوف ابھرا کہ اگر یہ چاہے تو الزام لگا کر میری عزت کا جنازہ نکال سکتی ہے لہذا وہ لالچ اور خوف کے تحت اس کے ساتھ بیاہ پر تیار ہو گیا۔

> "اس عمر کی کوئی لڑکی اپنے سے تین گنا عمر کے ایسے بندے پر زنا کی تہمت لگانے کی دھمکی بھی دے سکتی ہے کہ جس نے خود ایک دنیا کو آگے لگایا ہو۔"(۲۵)

مولوی کی بدنیتی اور موقع پرستی نے اسے ایک منکوحہ سے نکاح کرنے سے بھی نہ روکا اور جب اسے یہ موقع میسر آیا تو وہ بجائے ایسی صورت حال میں کوئی مناسب حل نکالنے کے، اپنی ہوس مٹانے کا سوچ سوچ کر خوش ہوتا رہا۔

> "قسمت کا دھنی تو تُو ہے کہ جس کے بوڑھے دروازے کی چوکھٹ پر وہ کم سن حسینہ سوالی بن کر آئی بیٹھی ہے۔ اللہ جانے کہ اُس کا دماغ خراب ہے یا مقدر۔ جب تک چلتا ہے تو کیوں نہ مفت کی اس نعمت کا لطف اٹھایا جائے۔"(۲۶)

ماں کی جہاں دیدگی اور تجربے نے بیٹی کو باز رکھنے کی کوشش کی اور اسے زمانے کی اونچ نیچ سے بھی آگاہ کیا۔ وہ اسے مولوی سے نکاح کرنے سے منع کرتی رہی۔ یہ بات اس کی اَنا سے زیادہ اس کی عزت اور نام کی جنگ کے مترادف تھی اسے لگتا تھا کہ اگر بات نکاح کی ہی ہے تو مولوی ہی کیوں اس کی بیٹی کے آڑے آرہا ہے اور بھی تو مرد تھے گاؤں میں وہ ان لوگوں سے ہی کیوں نہیں شادی کر لیتی۔ اس بات سے مصنف نے معاشرے کے اس گھناؤنے مولوی کا پردہ چاک کیا ہے جس نے منہ پر مذہب کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ اس حوالے سے مصنف لکھتے ہیں۔ "اگر نکاح پر نکاح جیسا منہ کالا کرنا ہی ہے تو وہ بوڑھا ٹھیکر مولوی کیوں۔"(۲۷)

اس کی ماں کی نظر میں یہ بڑی معیوب بات تھی لیکن سنگری کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا لیکن دوسری جانب سنگری کی بچے کے لئے ممتا بیدار ہو چکی تھی اور وہ اسے بچانے کے لیے ہر حد تک جانے کے لیے تیار تھی۔ اس ضمن میں اسے کسی سماج، معاشرے اور رِیت روایت کا پاس نہیں تھا۔ اسے نہ کسی کی عزت کا لحاظ تھا اور نہ اپنی جان کی پرواہ تھی۔ اس کی ٹھیٹھ اور اٹل زبان کے الفاظ کو مصنف نے یوں بیان کیا ہے: "سنگری نے صاف صاف کہہ دیا کہ شادی کرے گی تو مولوی سے ورنہ زہر کھالے گی، کوئی کنواں حرام کرے گی یا کہیں منہ کر جائے گی۔"(۲۸)

سنگری کے اندر ایک طرح کا تانیثی شعور اسے ایسے سوال اٹھانے پر مجبور کرتا تھا جو معاشرے میں مردانہ جبر کی حیثیت پر چوٹ کرتے تھے۔ بنیادی طور پر سنگری کی تربیت میں یہ چیز شامل تھی کیوں کہ اس نے ایک ایسے معاشرے میں پرورش پائی تھی جہاں ہمیشہ عورت کو اپنے حق کی خاطر لڑنا پڑا یا اسے اپنے حق کی خاطر کوئی نہ کوئی ناجائز قربانی دینا پڑی۔ معاشرے کے اسی رویے کی بدولت سنگری جیسی عورت نے جنم لیا اور معاشرے میں مزید خرابیوں کا راستہ کھولا۔ اس کے اس ذہنی رویے کے پس پردہ انگریزی تسلط اور جبر کے ساتھ ساتھ مذہبی جکڑ بندیاں اور مذہنی جبر شامل ہے۔ اس بارے میں مصنف یوں بیان کرتے ہیں:

> "مگر اتنا ضرور سنا گیا کہ جانے سے پہلے انہوں نے اپنے ساتھ شہیدوں کی بجائے بیس شہیدوں کا ماتم کیا اور پھر اجتماعی گریہ کرتے ہوئے بد دعا کی کہ جہاں جہاں بیس شہداء کا مدفن ہے اور جہاں جہاں ان کے جسم سے کہیں خون کا ایک ایک قطرہ بھی گرا ہے، وہاں نہ تو کبھی دریا بہے گا اور نہ ہی پانی زمین سے اُبھرے اور آسمان سے اُترے گا۔"(۲۹)

اسی بد شگونی کے خیال کا مظاہرہ تب بھی نظر آیا جب ایک مظلوم لڑکی کو بھی منحوس قرار دے دیا گیا جو کہ زیادتی کا شکار ہوئی تھی۔ یہ کہا جانے لگا کہ کس قدر منحوس لڑکی ہے وہ کہ پہلے دو نوجوان انجینئرز کے ساتھ پل بھر کے لئے مَس ہوئی تو دونوں کو ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے اور آج چند لمحوں کے لیے اُس کے ساتھ دیکھی گئی تو زندگی بھر کا کیا دھرا داغدار اور ملازمت انکوائری کے کٹہرے میں۔ مولوی بخشو کی فطرت میں کمینگی تھی، اب وہ بلیک میلنگ میں اور کھل گیا اور اس نے سنگری کو معاشرے میں اس کے بچے کی حیثیت کے حوالے سے بھی بلیک میل کرنا شروع کر دیا۔

> "وہ امانت کو ناجائز اولاد ثابت کرنے کی دھمکی دے کر سنگری سے راہ و رسم بڑھانا چاہتا تھا۔ اپنی نفسیاتی خواہشات کے سامنے اس قدر بودا اور پست ہمت ثابت ہو گا کہ حلال اور حرام کی تمیز کھو بیٹھے گا۔"(۳۰)

مولوی کے خاندان کی بے شرمی بے مثل تھی۔ اس کا بیٹا بھی اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی ماں کے ساتھ حرام کاری کا خواہش مند تھا۔ سنگری حیرت، غیرت اور شرم کے مارے وہیں سُن ہو کر رہ گئی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ بخشو ایک ہی جست میں بے غیرتی کی اتنی حدیں بھی پھلانگ سکتا ہے۔ بخشو کی استحصالی سوچ اس قدر گری ہوئی تھی کہ وہ بظاہر ایک بڈھے کے پلے باندھ کر سنگری کو خود استعمال کرنا چاہ رہا تھا۔ اسے اور کوئی مناسب راستہ نظر نہ آیا تو اس نے مذہب کا سہارا لینا چاہا تاکہ اپنے ناپاک مقاصد کو انجام دے سکے۔ اس حوالے سے مصنف یو لکھتے ہیں:

> "دیکھ سنگری ساری دنیا جانتی ہے کہ نہ تو میرے باپ کا تم سے کوئی حق کار شتہ تھا اور نہ ہی میں تیرا کچھ لگتا ہوں مگر پھر بھی بڑے زنان خانے سمیت ہر کوئی انگلی کھڑی کئے رہتا ہے کہ میں تمہاری خبر گیری کو کیوں آتا ہوں۔ کیا زمانہ آگیا ہے کہ ننگے سر والی عورت سے کوئی ہمدردی بھی نہیں کر سکتا۔ دیکھ میں تیرا کچھ نہیں لگتا مگر ہم درد تو ہو ناں، اس لئے کہتا ہوں کہ کسی سَترے بہترے سے حق کر لو تمہارا کام بھی سَر جائے گا اور میرا بھی کہ کوئی انگلی کھڑی نہیں کرے گا۔ پھر بائیں آنکھ دبا کر بولا ایک کُھنڈا ڈھونڈ رکھا ہے میں نے تمہارے لیے، وہ ہے ناں اپنا کوچوان آمدو چھڑا چھانڈ، منہ میں کوئی دانت نہیں اور آنکھوں سے کچھ دِکھتا نہیں۔"(۳۱)

اپنی بد نیتی میں ناکام ہونے کے بعد بخشو نے قلابازی کھائی اور سنگری کو گاؤں سے نکالنے کی دھمکیاں دینے پر اتر آیا۔ اب اسے اپنی ناکامی کے بعد اسے بستی کی معاشرت، ماحول اور رہن سہن میں بد کرداری کی گنجائش نظر نہیں آرہی تھی اور وہ اس کی اصلاح کرنا چاہتا تھا:

> "حرامزادی، گشتی! پہلے میرے پارسا والد صاحب کو خراب کرنے کی کوشش کی مگر جب ناکام ہوئی تو میرے پیچھے پڑ گئی۔ مگر میں تمھاری شیطانی باتوں میں آنے والا نہیں، میرا کردار مضبوط ہے، میں نے بہت حیا کیا کہ اِس لاوارثی کو پناہ ملی رہے، بچہ حرام کا ہے تو کیا ہوا اگر ماں باپ ہی منہ پر دانگی مل لیں تو حرام کی اولاد کا کیا قصور، مگر آج تو اس حرامن نے حد کر دی، میں وضو میں تھا مگر مجھ جیسے پرہیز گار پر ہی دست درازی شروع کر دی۔ اب میں نے تجھے نہیں چھوڑنا، نکال باہر کرنا ہے اس گھر سے بھی اور بستی سے بھی۔ یہ شریفوں کی بستی ہے بد کرداروں کی نہیں۔"(۳۲)

سنگری کی اس حالت کو دیکھ کر منگر کی خود کلامی اس حقیقت کا ادراک تھی کہ سیدا کہیں مر مرا گیا ہے۔ کیونکہ اگر وہ زندہ ہوتا تو یہ نوبت ہی نہ آنے دیتا۔ وہ یہ سوچنے لگ گیا سید ازندہ ہوتا تو اِس دھاونی گھوڑی کو اپنی رانوں کے نیچے سے نکلنے ہی نہ دیتا، پھر دنیا دیکھتی کہ یہ بہن سٹیک اَڑیاں کیسے کرتی ہے اور مردوں کو پاؤں کی ٹھوکر میں کیسے رکھتی ہے۔ اس کی یہ روایتی سوچ اس کمزور اور ذہنی تسلط زدہ معاشرے کی بدبودار کرداروں اور تعفن زدہ سوچ کی عکاس ہے جس میں منگر اور سنگری رہ رہے تھے۔ منگر بھی آخر اسی معاشرے کا فرد تھا اور منگر نے بھی مُلا کے گھر آنا جانا اور جھاتیاں ڈالنا شروع کر دیں۔ اس کی یہ روش دیکھ کر بخشو نے اسے دھتکارا اور اپنے گھر آنے جانے سے منع کر دیا۔ اس منظر کو مصنف نے یون بیان کیا ہے:

> "مُلا خاندان سے رشتے کی جڑت کے بعد جب لڑکیوں کے نزدیک رشتے بھی اجنبی قرار دے دیئے جاتے تو ایسے میں یہ دور پار کا سانڈ کیسے زنان خانے کی درسال سے جڑ کر کھڑا رہ سکتا تھا۔"(۳۳)

مولوی خاندان کا ہر فرد ہی ایک سے بڑھ کر ایک تھا، ملار کھا جو کہ مرحوم مولوی کا بھائی تھا، وہ بھی سنگری کے طلب گاروں میں شامل ہو گیا۔ مُلار کھا زنان خانے میں داخل ہوتے وقت بھی بار بار کھنگورا مارنے کے ساتھ ساتھ منگر جیسے لوگوں کی ماں بہن سے مختلف نوعیت کے رشتے جوڑنے کی زبانی کوشش کئے جارہا

تھا۔ اپنی برتری اور حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے مولوی کی پہلی بیوی کی سازشیں بھی اس معاشرے کی عورت میں احساس عدم تحفظ کا پتہ دیتی ہیں۔

"لہٰذا سنگری اور اُس کے کتورے کو قبر تک پہنچانے کے لئے حرام کاری اور چھ ماہیا بچہ پیدا کرنے جیسے الزامات اور ان کا چرچا، اِسی خاتون کے ذہنِ رَسا کی پیداوار تھے۔"(۳۴)

ماں بیٹے کے درمیان مولوی کے قتل کے متعلق راز داری اور باہمی تعاون بھی تھا۔ باپ کی موت سے پہلے وہ ماں کو جھوٹ موٹ کا رونا دھونا کرنے کا مشورہ دیتا ہے تا کہ قتل کی طرف کسی کا دھیان نہ جائے۔ بستی کے لوگوں میں نہ صرف یہاں کے افسروں بلکہ ہر اس شخص سے شدید ترین نفرت تھی جو ان کے بارے میں کوئی نرم بات کرنے کی کوشش کرتا۔ ان کے نزدیک دریائے ستلج پر لوہے کا پُل بنا کر اس کے اوپر سے لوہے کا شیطانی جن گزارنا یہاں کی دھرتی اور ستلج نَدی کو اَنواسی کرنا تھا جس کا مطلب سوائے بربادی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ سماجی ساخت کے معیار بدلے تو اَنواسیوں نے گھر گھر زمام کار اپنے ہاتھ میں لے کر گھر داری کے معاملات میں مردانہ گرفت کو کمزور تر کر دیا۔ بستی میں سنگری کی بدنامی کا یہ ایک پہلو اور صنفی تقسیم قابل ذکر ہے کہ اکثر عورتیں اس کے خلاف اور مردوں کی اکثریت اس کی حمایت میں تھی۔

"بستی کی عورتیں بھی بیک زبان اُس کے خلاف زہر اُگلتی رہتی تھیں کہ اس نے نہ جانے کہاں سے اپنا کنوارا پن کھویا مگر گبھن ہوتے ہی خاندان کے خاندان برباد کرتی چلی گئی حتیٰ کہ اُس شخص کو بھی پھٹے تک پہنچا دیا کہ جو ہمیشہ اس کی مصیبتوں کو اپنے سر لیتا رہا جب کہ مردوں کی اکثریت سنگری کی حامی ہو چلی تھی کہ کیسے کیسے اُس نے ان مردوں کے ظلم سہے جو اُس کے لائق ہی نہ تھے۔"(۳۵)

انگریز نے اس طرح اس معاشرے کو اندھا کیا کہ عورتوں کے علاوہ مولوی حضرات جو کہ کسی بھی معاشرے کے افراد کی بھلائی اور ان کو سیدھا راستہ دکھانے کے لیے ہمہ وقت اپنی خدمات پیش کرتے ہیں وہ بھی ان اثرات سے نہ بچ سکے اور سیلاب کی آمد سے جو سب سے واضح نقصان تھا وہ ملاؤں کے رسوخ کا ہوا۔ ان کی بری حالت تھی اور نفسا نفسی کی کیفیت میں کوئی بھی ان کا پرسان حال نہیں تھا۔ سیلاب اترنے کے بعد کی

تباہ کاری کے مناظر نے اس تمام مردانگی اور غیرت کو پاش پاش کر دیا تھا جس نے سینکڑوں گھر اجاڑ رکھے تھے۔

اسی طرح مقامی سماجی روایات بھی جہالت اور پدر شاہی پر استوار تھیں، عورت پر ہاتھ اٹھانا معمول کی بات سمجھی جاتی تھی اور عورت کی عصمت دری بھی عام بات تھی یہاں تک کہ عورت کو کسی گھٹیا چیز کی مانند سمجھا جاتا، عورت طاقت کے لحاظ سے تو کمزور تھی ہی اسے عزت نفس اور سوچ کے اعتبار سے بھی کمزور سمجھا جاتا تھا یہ رواج بہت پرانا چلا آرہا تھا جب کہ انگریز کے آنے سے اسے مزید ہوا ملی انگریز کے ہاں بھی یہاں کی عورت صرف ایک کھلونا سمجھی جانے لگی اور اسے صرف اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ "سنگری کے جملے کا دوسرا حصہ بھلا بن کر سیدھا اُس کے سینے پر جا گھسا تھا۔ اُسے کچھ سمجھ نہ آئی تو الٹا ہاتھ سنگری کے منہ پر جڑ دیا۔"(۳۶)

غیرت کے روایتی سماجی تصور کے مطابق ایک مرد ہوتے ہوئے اس کے لیے یہ تصور بھی سوہان روح تھا کہ اگر وہ خود کچھ کرے اور چاہے کسی بھی عورت کے ساتھ کرے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اگر عورت کوئی غلطی کرے تو اسے فوراً غیرت کا مسئلہ سمجھ کر اسے تشدد کا نشانہ بنانا یہاں تک کہ اسے قتل کرنے یا گھر بدر کرنے سے بھی گریز نہ کرنا۔ اور اس کو دنیا کی کوئی گری ہوئی یا ناکارہ چیز جان کر الٹا سیدھا بولنا اور اسے مختلف القابات سے نوازنا۔ عورت کی آزادی کو غیرت کے ساتھ نتھی کرنا اور اس کے کردار پہ انگلی اٹھانا اسی طرح عورت اگر اپنی رائے کا اظہار کرے تو سوال سیدھا اس کے کردار پر اٹھایا جاتا تھا اور غیرت جاگ جاتی تھی۔ جیسا کہ اس اقتباس میں بیان کیا گیا ہے۔

> "چھوہیر سنگری، اُس کے مرنے کے بعد کسی اور کی رانوں کے نیچے ہو گی کیوں نہیں چاہیے میرے ساتھ مُکلاوا؟ کوئی اور تاڑ لیا ہے کیا۔"(۳۷)

اس سے عورت کی عزت کی پامالی کو دیکھا جا سکتا ہے کہ وہ کس قدر مجبور اور لاچار ہے، یہاں عورت کی پسند ناپسند بے معنی دکھائی دیتی ہے۔ اگر کوئی عورت اپنے جذبات کو ظاہر کرتی ہے تو اس کے کردار پر انگلی اٹھائی جاتی ہے اور اس کو بدکردار سمجھا جاتا ہے۔ اردو ناول میں یہ موضوعات کی روایت پرانی ہے اس بارے میں انور پاشا اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

"اس دور کے ہندوستانی ناولوں میں عورتوں کی حیثیت اور ان کے سماجی اور معاشی مسائل کی عکاسی بھی نمایاں طور پر ملتی ہے۔ ان ناولوں میں عورتوں کے مختلف طبقے اور اس طبقے کے مسائل اور ان کی سماجی حیثیت کو ناول نگاروں نے الگ الگ زاویہ نظر سے دیکھا اور پیش کیا ہے۔ ان ناولوں میں طبقہ اشرافیہ اور جاگیر دارانہ ماحول اور معاشرت کی عورتوں کی زندگی کی تصویر بھی ہے اور اس معاشرت میں زندگی گزارنے والی نچلے طبقے کی عورتوں کی سماجی اور معاشی حیثیت کی عکاسی بھی۔ علاوہ بریں جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام میں اس استحصال کی تصویر بھی دیکھی گئی ہے"(۳۸)

یہاں عورت کا معاشرے میں مقام و مرتبہ ظاہر کیا گیا ہے جہاں اس کی خواہشات کو روند دیا جاتا ہے، عورت کے ساتھ ساتھ غریب اور لاچار لوگوں کی تصویر کشی کی گئی ہے جو سرمایہ داروں اور جاگیر داروں کے احسانوں کے تلے دبے ہوئے ہیں اور ان کی مرضی کے مطابق اپنی زندگی بسر کر رہیں ہیں انھیں اپنی زندگی کو اپنی مرضی سے جینے کا کوئی حق نہیں انھوں نے ہمیشہ مظلموں کی سی زندگی بسر کی ہے اور جاگیر داروں نے ان پر حکمرانی کی ہے۔ غریب صرف دو وقت کی روٹی کے لیے ہی زندہ ہے اور اس کی زندگی صرف یہاں تک محدود ہے۔

(ج) ناول "انواسی" میں کرداروں کی ذہنی کشمکش کے سماج پر اثرات

در اصل جب بھی کسی ایسے علاقے کی بات کی جاتی ہے جہاں کا ایک مخصوص رہن سہن اور منفرد نظریات ہوں تو وہاں ان نظریات کے پنپنے کی وجوہات کا ضرور دخل ہوتا ہے۔ اسی طرح جب ہم دریائے ستلج کی ساحلی بستیوں کی بات کریں تو ان علاقوں کی اپنی ایک مخصوص زندگی ہے۔ ان علاقوں کے لوگ زندگی کے احسانات کے صرف نظر زندہ رہنے کو اپنی شان سمجھتے ہیں۔ عزت اور غیرت ان کے لیے سب سے اہم چیز ہے۔ جہاں بات ان کی عزت پر آجائے تو پھر کسی کی بھی جان کی پرواہ کیے بغیر چلتے دکھائی دیتے نظر آتے ہیں۔ اسی منظر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

"صورت حال اتنی خراب تھی کہ "ایسے دھن کی حفاظت کرنے میں امکانی طور پر ناکام والدین اسے پرایا دھن قرار دے کر جلد از جلد وہاں سونپنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جہاں سے اُس کے بدلے میں اُن کی من چاہی حاجت پوری ہو سکے"۔(۳۹)

ان علاقوں کے رہنے والے لوگوں کی مجبوری اور اس مجبوری کا ذہنی عکس واضح انداز میں نظر آتا ہے۔ان کے ہاں ضرورت پوری کرنے کے لیے ضروری نہیں کہ پیسہ کی ڈھال بنایا جائے بل کہ کوئی بھی چیز اس کی جگہ لی سکتی ہے پھر چاہے وہ کسی کی زندگی ہی کیوں نہ ہو۔یہ روایات ان کے ہاں صدیوں سے چلی آرہی ہیں۔انہیں روایات کی ایک کڑی اس ناول کی ہیروئین بھی ہے جسے مصنف نے یوں بیان کیا ہے۔"یہ بات اس قدر مقبول ہو چکی تھی کہ ایک جگہ ناول کی ہیروئن سنگری خود اپنی مان سے یہ کہتی ہے کہ "اماں مجھے اغواء ہونا ہے۔"(۴۰)

دوسری طرف ہیروئن بھی اپنی طرح کا یک ہی نمونہ تھی اور اس ماحول میں رہتے ہوئے ہٹ دھرم اور بے شرم ہو چکی تھی۔جب سیدے نے اس کا مطالبہ ماننے سے انکار کیا تو وہ صریح ضد پر اتر آئی اور اس کی غیرت کو چیلنج کر دیا:

"نہیں دے گا ناں تو میں بھی کسی آتے جاتے کہ نیچے لیٹ جاؤں گی اور منہ پہ کالک تمہارے پھرے گی کہ سیدے کی بیوی فلاں کے ساتھ چَڈا کھولے پڑی ہے۔"(۴۱)

پدر سری ذہنیت نے جب زور پکڑا تو معاشرے میں عورت کی عزت کا جنازہ نکلنے کے ساتھ ساتھ اس کے حقوق بھی سلب ہونے شروع ہو گئے اور اس ناول میں ایسے کردار موجود ہیں جو اس کی نشاندہی کرتے دکھائی دیتے ہیں جن میں سیدے کا کردار ہمارے سامنے ہے اس کی بات چیت کا ایک اقتباس ذیل میں دیا گیا ہے اور سیدے نے بھی جواباً جو کچھ کہا وہ پدر شاہی نظام میں پیدا ہونے والے ایک اجڈ اور اکھڑ شخص کا جواب ہے۔"تجھے شوق ہے ناں آتے جاتے کے سامنے چَڈا کھولنے کا تو مجھے بھی ہُنر آتا ہے اِسے چیرنے کا لات پے لات رکھ کر۔"(۴۲)

آدم واہن کا ماحول بھی وسیب کے دیگر خطوں کی طرح محبت اور پیار کے رشتوں سے گندھا ہوا تھا اور لوگ ان روایات اور رشتوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے پیوست تھے جن کی بنیاد خون اور نسل کی بجائے رسوم پر تھی۔ذہنی کشمکش کی بہت سی مثالیں اس ناول میں موجود ہیں اور ایسا نہیں کہ ایسی ذہنی حالت ان لوگوں وراثت میں ملی ہے یہ انگریزی تسلط کا ہی نتیجہ ہے۔ایک ماں کی بے بسی اور بے یقینی کا عالم اس کی بیٹی کی حالت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ایک ماں اپنی ہی بیٹی کی عصمت دری پر خاموش ہونے پر کس طرح مجبور

ہے۔جب سنگری گھر واپس آئی تو اس کی ماں بے بسی کی وجہ سے اس سے یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ اصل ماجرا کیا ہے اور اسے ہوا کیا ہے۔ "میں تجھ سے نہیں پوچھتی اور تو بھی بے شک نہ بتا لیکن جا اوڑ جا کر لیٹ جا۔"(۴۳)

اسے یہ شک بھی تھا کہ سنگری نے خود ہی کوئی غلط سلط حرکت کی ہے اور اب پشیمانی کی وجہ سے اس سے چھپ رہی ہے مگر وہ اس سے یہ بات پوچھ نہ سکی۔اس معاشرے نے بے یقینی کی فضا پیدا کر دی جس نے رشتوں میں بھی دراڑ ڈال دی یہاں تک کہ ایک ماں کو بھی اپنی بیٹی کی بے گناہی اور بے بسی پر یقین نہیں تھا وہ بھی اسے جھوٹا اور مکار سمجھ رہی تھی اور اپنی ہی بیٹی کے کردار کر انگلی اٹھا رہی تھی اس کی بہت سی مثالیں ہمیں ناول میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "ملوکاں اس سے پوچھنا چاہ رہی تھی کہ وہ اگر خود ہی سیدے کو نیچا دکھانے کے لیے کہیں کسی کے نیچے لیٹ کر آئی ہے تو اب یہ پچھتاوے کا ناٹک کیسا مگر ایسا چاہنے کے باوجود اُس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی، بہت برا کیا ہے سنگری نے اگر ایسا کیا ہے تو۔"(۴۴)

اس کی ماں اس قدر بے یقینی اور عدم اعتماد کا شکار تھی کہ اسے تقریباً اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ جو ہوا وہ سنگری نے خود کیا ہے اور اب معاشرتی دباؤ سے بچنے کے لیے اسے یقین دلا رہی ہے کہ میں بے قصور ہوں۔حفیظ خان نے اس ناول میں اس معاشرے کی جس انداز میں صورت گری کی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ناول کے اندر جتنے بھی کردار نظر اتے ہیں وہ اپنی پوری حقیقت کو ساتھ لیے چلتے ہیں۔ جس طرح منٹو نے ہندوستانی معاشرے کو دو ٹوک انداز میں اپنے افسانوں میں پیش کیا اسی سے ملتے جلتے انداز میں جس میں کوئی بھی بات ڈھکے چھپے انداز سے ہٹ کر بیان کی گئی ہے۔اس کی ماں کو سنگری پر بالکل اعتماد نہیں تھا اور وہ اس بات سے مسلسل خوف زدہ تھی کہ سنگری سیدے کی ضد میں آکر کچھ ایسا کر دے گی جس سے معاشرے میں اس کی بدنامی ہو گی۔ایک ماں کی حد تک تو بات کچھ زیادہ قابل اعتراض نہ ہوتی لیکن جب اس کی بن بیاہی بیٹی کی عزت کی بات آئی تو وہ سہم گئی۔اس کی ماں کی ذہنی حالت سے اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک عورت کے لیے اس کی عزت ہر دور میں ایک معمہ رہی ہے اور اسے ڈر ڈر کر جینے پر مجبور کرتی ہے۔ مصنف نے اس کے شکوک و شباہت کو اس طرح پیش کیا ہے۔ "وہ کسی کتے کا بیج اپنے پیٹ میں رکھوا کر آجائے گی اب وہ بھی محض اپنے نکاح میں آئے ہوئے گھر والے کو نیچا دکھانے کے لئے۔"(۴۵)

یہی شک ایسی حالت تک لے آیا کہ وہ سنگری سے غصے میں آکر یہ پوچھنے لگی کہ اس کے حاملہ ہونے میں کس کا کردار تھا۔ تو بتاتی کیوں نہیں کہ کس کُتے کا بیج اپنے پیٹ میں لئے پھرتی ہو؟ تجھے شرم نہیں آئی یوں اپنے آپ کو برباد کرتے ہوئے۔ منگر اور سنگری کے مابین جذباتی و ذہنی کشمکش بھی معاشرتی اقدار کا ڈر واضح تھا۔ منگر شاید ہاتھ پکڑنے والے واقعے کے بعد اس بات سے ڈر رہا تھا کہ وہ کسی کو بتا نہ دے اور اسے اس بات کا یقین دلانے کے لیے کہ اس کی نیت ٹھیک ہے، اسے شادی کی پیش کش کر ڈالتا ہے۔ "منگر نے ڈولی لے جانے والا جملہ خاص طور پر اس لیے زور دے کہا کہ سَنگری کا ردِ عمل اُس شام کے اتفاق ٹاکرے کے پسِ منظر میں جان سکے۔"(۴۶)

بستی کے باسیوں میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن کو حقیقی حالات کا ادراک ہو چکا تھا اور وہ منگر کی اس بات کو جائز سمجھتے تھے کہ انگریز کے ساتھ لڑائی کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایسا نہیں کہ منگر ایک ڈرپوک انسان تھا اور گاؤں والوں کا نقصان چاہتا تھا بلکہ وہ جانتا تھا کہ انگریز کے کیا ارادے ہیں اور وہ کرنا چاہتا اور اس کہ ساتھ ساتھ اسے انگریز کی طاقت کا بھی بخوبی اندازہ تھا۔ منگر کی ذہنی پختگی کو مصنف نے یوں بیان کیا ہے۔

> "منگر اُس کا قصور تو بس اتنا تھا کہ آنے والے وقت کو بھانپتے ہوئے بستی کے غریب لوگوں کو انگریز سرکار کا مقابلہ کرنے سے اس لیے باز رکھا کہ گورا اپنا ارادہ پورا کر کے رہے گا اور یہ لوگ خواہ مخواہ بے موت مارے جائیں گے۔"(۴۷)

دوسری طرف مردانگی کا روایتی تصور اس کے حواس پر سوار تھا جس کے مطابق لڑکیاں جھگڑوں میں جیتے جانے والے انعام کی طرح ہوتی ہیں اور حاکمانہ فطرت کے حامل تشدد پسند مرد سے محبت کرتی ہیں۔۔۔ اور یہ کہ ان میں طاقت ور کی پوجا کا رجحان ہوتا ہے۔

> "لڑکیاں منت ترلوں سے آتی ہیں اور نہ ہی شرط شرائط رکھنے سے لڑکیوں کو فتح کرنا پڑتا ہے اس طرح کہ تاج مرد کے سر پر ہو اور تخت پر وہ خود بیٹھے لڑکیاں پوچھ ہلانے والے کُتوں کے پیچھے نہیں جاتیں وہ تو جاتی ہیں اُن کے پیچھے جو گردن میں دانت گاڑیں اور سارے بدن سے روح نکال لیں تمہیں تو بچ سے چھوہر کا ہاتھ پکڑنا بھی نہیں آتا کہ اسے کلائی سے جکڑ کر پکڑا جاتا ہے یا اس کے ہاتھ کو اپنی پولی پولی انگلیوں سے کسی کیچوے کی طرح! یہ جو عورت ذات ہے ناں یہ طاقت سے آتی ہے، طاقت سے رہتی

ہے اور کمزوری بن کر طاقت پر راج کرتی ہے اس طرح کی ہر طاقت ور، مزید طاقت کی خواہش میں دولت سے بھی پہلے عورت کی طرف جھپٹتا ہے اور دولت کو اُسی کے قدموں میں نچھاور کیے رہتا ہے۔"(۴۸)

مصنف نے جابجا اس معاشرے میں عورت پر ہونے تشدد کی عکاسی کی ہوئی ہے، اسی طرح کی ایک مثال یہ ہے کہ جب سنگری منگر کو کچھ برا بھلا کہتی ہے تو وہ اس پر اپنی پوری طاقت سے حملہ کرتا ہے اور اس کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پر اپنی مردانگی کا رعب دکھاتا ہے۔ عورت اس معاشرے میں جن بھی مسائل کا شکار ہے مصنف نے ان مسائل کو ایک ایک کر کے اس انداز میں بیان کیا ہے کہ قاری کی آنکھ ان تمام مناظر کو اپنے سامنے ہوتا دیکھتی ہے۔ جیسا کہ مصنف لکھتے ہیں۔ "سنگری کی باتیں سُن کر دانت کچکچاتے منگر نے الٹے ہاتھ کا جھاپا اتنے زور سے اُس کے منہ پر دیا کہ وہ ٹیڑھا ہو کر رہ گئی۔"(۴۹)

منگر نے نہ صرف اس پر ایک دفعہ ہاتھ اٹھایا بل کہ ایسا پہلے بھی کر چکا تھا اور اس طرح کے کام کرنے میں اسے کسی قسم کی گھبراہٹ کا احساس نہیں ہوا اور نہ ہی اسے بعد میں اس بات کا پچھتاوا ہوا کہ اس نے ایک عورت کے اوپر ہاتھ اٹھایا ہے اور اسے کس طرح کی تکلیف کا سامنا ہے۔ منگر کی موقع پرستی اور ہوس کا یہ حال تھا کہ ایک طرف تو وہ اس کی توجہ کی بھیک مانگ رہا تھا اور دوسری جانب اسی کو ہی بدنام کر رہا تھا تاکہ جب وہ سچ بولے تو کوئی بھی اس پر یقین کرنے کو تیار نہ ہو۔ اس حوالے سے مصنف لکھتے ہیں کہ:

"منگر نے خود ہی واویلا مچا دیا کہ صبح صبح باہر جانے کے بہانے کسی کے ساتھ بھاگی جا رہی تھی اور وہ بہت مشکل سے اسے پکڑ لایا ہے۔ منگر نے اسے بازو سے پکڑا اور دوبارہ گھسیٹتے ہوئے کمرے میں لے گیا جہاں رکھے ایک بڑے ماچے پر گرا کر تیزی سے باہر نکلا اور باہر سے کُنڈی لگا دی۔"(۵۰)

وہ فطرتاً ایک بدخو اور کمینہ انسان تھا جو اس کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے درپے تھا اور سماج میں اس کی حیثیت کو نقصان پہنچانے کے ساتھ ساتھ اسے جسمانی طور پر تشدد کا نشانہ بھی بناتا تھا۔ اور تو اور جس معاشرے میں وہ رہتی تھی یعنی جس معاشرے کو حفیظ خان نے اس ناول کے اندر تہ در تہ چیزوں کو بیان کیا ہے اور قاری کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ انگریز نے کس حد تک اس معاشرے میں ظلم اور بیگاڑ کا سامان مہیا کیا ہے۔ اس معاشری کی بگڑی حالت وہاں کے رہنے والے ہر فرد کی زندگی سے جھلکتی نظر آتی

ہے۔ ہر مرد اور عورت ان اثرات سے دوچار ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ جیسا کہ مصنف نے اس معاشرے کی عورتوں کی حالت کو بیان کیا ہے۔ "صبح کاذب کی ملگجی روشنی پھیلی تو ہر سو بربادی کے مناظر نے جہاں مرد مردوں کو دھاڑیں مار کر رونے پر مجبور کر دیا وہاں عورتوں کے بین بھی بلند تر ہوتے چلے گئے۔"(۵۱)

آدم واہن کے تناظر میں سماجی تعاملات پر بچاؤ کی خواہش کے اثرات سے کہانی گو پر فلسفیانہ انداز میں زندگی کی حقیقت یوں آشکارا ہوتی ہے۔ یہی حالت کچھ مختلف انداز میں اس بزرگ پر بھی کھلی جس نے جوانوں کو نصیحت ذرا غیر روایتی انداز میں کی تھی۔ سیلاب کے بعد کی صورتِ حال سے معاشرے کی وہ ساری حدود و قیود تباہ و برباد ہو گئیں جن کا پاس رکھنا عام حالات میں جان سے زیادہ عزیز سمجھا جاتا تھا۔ مصنف نے اس سارے منظر نامے کی بڑی عمدہ صورت گری کی ہے اس حوالے سے وہ یوں لکھتے ہیں:

> "ایک دوسرے کے جسموں سے اٹھنے والی بدبُو اس تعفن سے جو سیلابی پانی میں تیرتی ہوئی انسانی اور جانوروں کی لاشوں سے اٹھ رہا تھا۔ اس پر قیامت رات کو مچھروں کی یلغار اور دن میں مکھیوں کی بھرمار۔ بستی کے شرفا کے ایسے خاندان کی خواتین بھی سڑک کی گرد میں خوار ہو رہی تھی کہ جنہیں کبھی کسی نے بے پردہ نہیں دیکھا تھا۔"(۵۲)

معاشرے کی جہالت اور ذہنی افلاس کا یہ عالم تھا کہ شادی کے چھ ماہ بعد بچہ پیدا کرنے پر مولوی کے کردار پر سوال اٹھانے کے بجائے لوگ اسے اس کی کرامت سمجھ رہے تھے۔ صرف نام کے ایک مذہب کے پجاریوں کو اصل دین سے اتنا دور رکھا گیا کہ ان کے ذہن اس بات کی طرف آ ہی نہ سکے کہ مولوی نے کیا گندی حرکت کی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کی ذہن سازی ایسے ماحول میں ہوئی کہ انہیں اس کے علاوہ نظر ہی کچھ نہیں آیا کہ یہ تو مولوی صاحب کی کرامت ہے کہ انہوں نے چھ ماہ میں ہی بچہ پیدا کر دیا۔ اس صورت حال کو مصنف نے ناول میں یوں بیان کیا ہے:

> "چھ ماہ بچوں سے یکسر منفرد وضع کا تگڑا اور تنومند۔ مولوی صاحب کی مردانگی کے ہر سُو چرچے کہ پہلے ہی پلے میں بیچاری ملوک چھوہر کو گبھن کر بٹھایا اور بیج اتنا خالص کہ پیٹ میں چھ ماہ سے زیادہ اٹھار کھنا اس کے لئے ممکن ہی نہ رہا"۔ (۵۳)

معاشرے پر مولوی کا اثر ورسوخ اور عوام کی ذہنی پستی کا حال یہ تھا کہ کسی ایک شخص کی نگاہ بھی ان حقائق کی طرف نہ گئی جن کا وقوع کسی بھی اور شخص کی کردار کشی کے لیے کافی تھا۔ اور یہ حقیقت سنگری پہلے سے جانتی تھی۔

> "اُس کے حمل کی بحفاظت واضعگی کے لئے مولوی صاحب سے بہتر چوکیدار کا ملنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ بستی کے لوگ یار شتے دار سنگری پر حرام کاری کا الزام لگاتے تو پھر بھی سزا کے لئے مولوی صاحب نے ہی پیش پیش ہونا تھا لیکن اس نکاح کے بعد نہ تو مولوی صاحب نے آواز نکالی اور نہ ہی کسی اور کو جرات ہوئی۔ ملوکاں کو اپنی بیٹی کی معاملہ فہمی پر حیرت ہو رہی تھی۔"(۵۴)

اس معاشرے کی اکثریت کوئی رائے نہیں رکھتی تھی۔ وہ دوسروں کی پیروی کرتے تھے لہذا جب کسی نے منگر کے خلاف بات کی تو رائے عامہ کی تبدیلی اور نا اتفاقی کا ادراک کرتے ہوئے بہت سے نوجوان اسکے خلاف ہو گئے۔ انہوں نے منگر کے خلاف بیان دیا اور اسے قصور وار ٹھرایا۔ ان نوجوانوں کی اپنی سوچ پر اتنے مظبوط تالے لگائے گئے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو پہچان ہی نا سکے اور جیسی انکی ذہن سازی کی گئی کہ بس جو کہا جائے وہی بیان کی صورت میں جہاں چاہا بول دیا جائے۔ وہ نوجوان انگریز کی چال کو سمجھنے سے قاصر تھے کیوں کہ انہیں انگریز پہلے ہی ذہنی اپاہج کر چکا تھا۔ اس حوالے سے حفیظ خان لکھتے ہیں:

> "اس کے ساتھ ہی ایک گروہ نوجوانوں کا ایسا بھی وجود میں آگیا کہ جس نے اس افسوس ناک صورتحال کا ذمہ دار کھلم کھلا منگر کو قرار دے دیا کہ جو اپنی بزدلانہ حرکتوں کے سبب بستی کے لوگوں کو سیدے کے خلاف بھڑکا کر انگریزوں کے ہاتھ مضبوط کرتا رہا اور بالآخر سیدے کی موت یا گمشدگی کا باعث بنا۔"(۵۵)

ان پے در پے واقعات نے عوام کی بیداری کو پڑھایا اور مولوی کی موقع پرستی کا احساس ہوتے ہی وہ اس کی جان کے دشمن بن گئے۔ اس معاشرے کا ایک مولوی بھی اتنا موقع پرست اور دوغلہ ہے کہ قاری کی آنکھ شرم سے جھک جاتی ہے۔ جس کردار سے اس معاشرے کے لوگوں نے اپنے بچوں کی تربیت کرنی تھی اس کا اتنا مکروہ اور فریب سے لبریز کردار کسی کو کیا متاثر کرتا۔ اس کی اصل حرکات کو دیکھ کر لوگ اس کی جان

کے دشمن بن گئے اور لوگوں کی ذہنی حالت کو مصنف نے یوں بیان کیا ہے۔ "اتنے میں ہجوم میں سے کسی نے نعرہ لگایا کہ مولوی جار اُللہ کے زنان خانوں کو بھی آگ لگا دی جائے"۔ (۵۶)

عوام کے جذبات کی شدت اور انتقام کی آگ اس قدر زیادہ تھی کہ وہ کسی کی بات سننے کو تیار نہ تھے۔ وہاں موجود تمام لوگ صرف ایک بات پر ڈٹے تھے کہ کس طرح اس سے جان چھڑوائی جائے اور اسے ختم کر کہ تمام معاملہ نمٹایا جائے۔ اس تمام صورت حال سے اس معاشرے کی ذہنی بیچارگی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لوگ کس طرح اپنی سوچنے کی صلاحیتوں سے محروم ہیں اور انگریز کی چال میں پھنستے چلے جا رہے ہیں۔ اور لوگ کس طرح کی زبان کا استعمال کرتے ہیں اور کیسی کیسی گالیاں بکتے ہیں اور اس بکواس کا استعمال کچھ لوگوں کو بُرا لگا تو ہجوم میں سے کسی نے دو چار ہاتھ اُس شخص کو جڑ دیئے کہ جس نے بکواس کرنے کو کہا تھا۔ عوام اس قدر غصے میں تھی کہ ان کی سوچ سمجھ کی صلاحیت ہی ختم ہو گئی تھی اور محض شک کی بنیاد پر ہجوم نے ایک آدمی کو نہ صرف جان سے مارا بلکہ اس کی لاش کا بھی کچرا کر دیا۔

> "اس کے گرتے ہی لوگوں نے اپنے پاؤں زور زور سے اُٹھا کر اُس گرے ہوئے شخص کے پورے بدن پر اس طرح مارنا شروع کیے کہ کچھ ہی دیر میں وہ جیتے جاگتے انسان سے گوشت کے لوتھڑوں میں تبدیل ہو گیا۔" (۵۷)

ان کی وحشت اور بربریت دیکھنے والوں کے لیے قابلِ یقین تھا کہ لوگ اس قدر وحشی بھی ہو سکتے ہیں۔ خدا کی پناہ کہ محض پاؤں کی پے در پے ضربات سے ایک جیتے جاگتے انسان کو کچلے ہوئے گوشت کی ڈھیری بنا دیا گیا۔ معاشرہ بالکل ہی جنونی اور غیر انسانی بن چکا تھا، کبھی مکمل بے شعور اور کبھی اتنا ظالم کہ درندہ بن چکا ہو۔ "مولوی جار اُللہ کے سامنے سر نہ اٹھانے والے لوگوں کا یہ روپ دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔" (۵۸)

مولوی پر حالات کی تبدیلی کا اثر اتنا زیادہ ہوا کہ لوگوں کی نظروں میں پارسائی کھونے کے بعد مکمل طور پر تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔ کم از کم مولوی کے کردار کے اندر ایک بات دیکھنے کو نظر آتی ہے جب وہ لوگوں کی نظروں کے سامنے ننگا ہوا تو اسے اس بات کا احساس تو ہوا کہ اس نے کیا کیا غلطیاں کی ہیں۔ مولوی تو ٹھیک اس معاشرے کے باقی لوگوں کی حالت بھی طوائف الملوکی کے سبب جانوروں سے بھی بدتر تھی۔ وہ بیک وقت مظلوم بھی تھے اور ظالم بھی، منگر کے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ وہ انہیں کیا سمجھے۔ اس معاشرے کے

عمومی حالات میں امن پسندی کا یہ عالم تھا کہ لوگ اسلحے کی شکل تک سے ناواقف تھے اس بستی میں تو کلہاڑی بھی شاید کسی چرواہے کے پاس ہو، یہاں تو خنجر بھی کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ کچھ تو سماجی شعور کا فقدان اور کچھ تقدیر کا جبر تھا کہ ایک بے قصور بچی کو وہ سب بھگتنا پڑ رہا تھا جو کسی طرح بھی اس پر نہیں مسلط کیا جانا چاہیے تھا۔ "اس نے نگاہ بھر کر اُس چھوٹی سی بچی کو دیکھا جو پیدا ہونے سے پہلے ہی اپنا باپ نطفے کے مغالطّوں اور سماجی تعین کی تہذیبی بھول بھلیوں میں کھو چکی تھی۔"(۵۹)

سنگری بھی در در کے دھکے کھا کر مزید بد تہذیب ہو چکی تھی اور اسے ماں کو طعن و تشنیع کرنے میں بھی کوئی شرم نہیں محسوس ہوتی تھی۔ منگری اپنے جذبات کا اظہار بڑے منفرد انداز میں کرتی ہے۔ مجھے کیا پڑی تھی اس بوڑھے ریچھ کے سامنے چڈے کھولنے کی۔ ہے تو تُو میری ماں مگر سمجھ تجھے ککھ کی نہیں، اِسی لیے پوری زندگی میرے باپ سے جوتے کھاتی رہی۔ عورت کا روایتی پدر شاہی تصور جو اس معاشرے میں رائج تھا وہ قطعاً غیر انسانی اور جاہلانہ تھا۔

> "مرد تو وہ کسی کام کا ہوتا ہے جو عورت کے تَرلے نہ کرے، نیچے لگا کے رکھے مگر پیار سے۔ تھپڑ مارے مگر جوتا نہیں۔ خود بے شک مار کر نیلو نیل کر دے، چمڑی ادھیڑ دے مگر کسی کو انگلی نہ کھڑی کرنے نہ دے۔ بستی کا وَڈا بھلے سے نہ ہو مگر وَڈ کوں جیسا ہو، وہ گالیاں بھی دے تو کانوں میں ماکھی ٹپکے، ظلم کرے تو اُس پر پیار آئے۔ وہ مقدم بھرے تو بھوئیں کو کانبا ہو، چاند نکلے تو وہ مشکی سانپ کی طرح کالا لگے اور رات کالی ہو تو چاند بن جائے۔ پوہ میں ٹھنڈی لُوری چلے یا ہاڑ میں تتی لُو تو پورا پنڈا اس کی تانگھ میں ہُوں ہُوں کرنے لگے۔ بادل گرجے تو وہ یاد آئے اور دریا چڑھے تو اُس کا سینہ سامنے ہو۔"(۶۰)

سنگری کا تانیثی شعور بہت گہرے تجربات کا آئینہ دار ہے۔ اس نے اپنی زندگی سے ان تمام نا انصافیوں اور امتیازات کا سامنا کیا جن سے عورتوں کو گزرنا پڑتا ہے۔ ایک عورت کو کسی بھی معاشرے میں بہت سے مسائل کا سامنا رہتا ہے لیکن انگریزی تسلط کے زیر اثر اس معاشرے کے افراد کی ذہنی حالت نے عورت کا جینا دشوار کر رکھا ہے۔ اس حوالے سے مصنف لکھتے ہیں:

"او میری ماں تُو تو جانتی ہے کہ یہ باتیں ہمیں اور کوئی نہیں سکھاتا، پیدا ہوتے ہی ہمارا عورت ہونا ہمیں یہ سبق پڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ اب تو مکرے تو اور بات ورنہ یہ باتیں تجھے بھی معلوم ہیں اور مجھے بھی معلوم ہوتی جارہی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تو انہیں زبان سے نکالنا نہیں چاہتی اور مجھے وہ حرامی سید ازبان سے نکالنا سکھا گیا ہے۔ وہ ویسا ہی مرد تھا کہ جیسا میری طرح کی عورت کو چاہیے ہوتا ہے مگر اس دھی چود کو میری "ناں" کو سمجھنا ہی نہیں آیا، بجائے میری چمڑی ادھیڑنے کے، میرے اندر ہی تھوک کر چلا گیا اور وہ بھی زبردستی۔ ان بھڑوے مردوں کو پتا ہی نہیں کہ عورت ہے کیا اور کیا چاہتی ہے۔ یہ عورت کو اس کے چَڈے چیر کر فتح کرنا چاہتے ہیں۔ جب کہ عورت کہتی ہے کہ میرا دل چیر کر مجھے فتح کرو مگر یہ حرامی اپنی آکڑ خانی قائم رکھنے کے چکر میں نہ دیکھ پاتے ہیں اور نہ سُن پاتے ہیں، بس ترلے کرتے ہیں، تلوے چاٹتے ہیں اور پھر بھی کچھ نہ بن سکے تو جانوں مار دیتے ہیں۔"(۶۱)

معاشرے میں رائج اخلاقی قیود کا ادراک اور ان کی پامالی کا احساس ہمیں اس کی ہر حرکت سے محسوس ہوتا ہے۔ اس کی ٹھیٹھ زبان اور اس کا رویہ ہر لمحہ اس کی اندرونی کہانی بیان کرتا ہے۔ جب بھی اس کی بات اس کی ماں کے ساتھ ہوتی ہے تو وہ عجیب طرح کی باتیں کرتی دکھائی دیتی ہے وہ کہتی ہے کہ کیوں پھٹے لگتی ہے ماں ابے کو قتل کرنے کے جرم میں، تم نے جس طرح اس بیمار کو مارا ہے ناں وہ اب مرنے جارہا ہے۔ اُس کی وَکھیاں اندر سے کُھل گئی ہیں، گُردے ختم اور کلیجہ پھٹ گیا ہے۔ اب تو کچھ ہوش کر ٹھنڈی ہو ذرا اور جا کر آنسو بہالے تاکہ عزت رہ جائے۔ اسی طرح بہت سے کردار ہمارے سامنے اس معاشرے کی جیتی جاگتی تصاویر پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے کہ ماں بیٹے کی گفتگو سے جھلکتا ہے کہ کس طرح لوگ ان کا ساتھ دیتے ہیں اور ان کا کیا ارادہ ہے۔ اس منظر کو مصنف نے ناول میں یوں بیان کیا ہے:

"شام سے پہلے پہلے میں نے طے کرنا ہے کہ چاچے رکھے کو تو نے زہر دیا ہے یا وہ خود ہی کُشتہ کھا مرا ہے۔ اور ہاں پورے خاندان نے پوری بستی نے سب چھوٹے بڑے نے میری بات سننی ہے اور میری بات ماننی ہے۔"(۶۲)

بخشو کا عیاش ذہن اور ہوس اسے داروغہ کے سامنے اپنی سوتیلی ماں کے متعلق جنسی زبان میں گفتگو سے نہ روک سکا اور وہ باپ کی میت پہ ہی اپنی میلی نیت کا اظہار کرنے بیٹھ گیا۔ کسی کی بھی عزت کا خیال نہ رکھتے

ہوئے بس اپنے بارے میں سوچنا ایک طرح کی مفلسی ہی کا عنصر ہے کہ ایک بیٹا ذہنی طور پر اس حد تک مفلوج اور بیکار نظر آتا ہے کہ اسے اس بات کا خیال ہی نہیں کہ وہ کس جگہ بیٹھا ہے اور اسے کس جگہ کونسی بات کرنی ہے۔ ایک شخص کو دنیا کی کوئی خبر بھی نہیں ہے۔ اس سے زیادہ کوئی معاشرہ کیسے مفلوج ہو گا کہ جسے اپنے کردہ کاموں کی ہی خبر نہیں ہے۔ بخشو کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے کتنے برے معاشرے میں پرورش پائی ہے۔ اس حوالے سے حفیظ خان یوں لکھتے ہیں۔

> "یار ایسی عورتیں پھانسی لگانے کے لئے نہیں ہوتیں۔ بخشو کے چہرے پر موہوم سی مسکراہٹ لپکنے لگی تھی۔ کیسی عورتیں؟ سوال اب بھی داروغہ کی آنکھوں میں تھا، حرامی عورتیں، جنہیں پتا ہو کہ وہ سوہنی کتنی اور اُن کا مُل کیا ہے۔"(۶۳)

کہانی کے آخر میں اس وقت ایک بہت ڈرامائی صورت حال پیدا ہوئی جب داروغہ کو سنگری نے بڈھے کے اصل قاتل کے بارے میں بتا دیا۔ یہاں بھی اس علاقے کی معاشرتی صورت حال اس طرح واضح ہوتی ہے کہ وہ اسے واقعات کی ترتیب سے شناخت کرنے کے بجائے کسی "نیک روح" کا کرشمہ قرار دینے لگے۔ یعنی جہالت کا یہ عالم کسی بھی معاشرے میں لوگوں کی حالت کا عکاس ہوتا ہے کہ لوگ کیا سوچتے ہیں۔ ان لوگوں کے ذہنوں پر اس حد تک قبضہ ہے کہ وہ کسی بھی صورت حال کو بھانپنے سے قاصر ہیں۔

> "سب کچھ صاف صاف بتا دیا ہے عورت نے کہ مولوی صاحب کو کس نے اور کب قتل کیا۔ مُلا بخشو کا چہرہ ایسے اُترا کہ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ قتل کا یہ مقدمہ پہلی تفتیش میں اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے حل ہو جائے گا کہ چشم دید گواہ کو بھی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ مولوی اللہ رکھا کا کہنا تھا کہ کوئی نیک روح کہ اپنا مجرم قبر میں اُترتے ہی اِس طرح پکڑوایا کہ کسی بے گناہ کو لِتر پولے مٹانے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔"(۶۴)

اس معاشرے میں پدر شاہی سوچ اس قدر رچ بس چکی تھی کہ وہ ہر ناکامی کے بعد اس کی ذمہ داری ڈالنے کے لیے انواسیوں کو تلاش کر لیتے تھے۔ بستی کے عوام کی افسران سے نفرت کا حال یہ تھا کہ وہ ان کے بارے میں کوئی نرم بات بھی سننے کو تیار نہیں تھے۔ یہ تمام تر صورت حال ایک طے شدہ منصوبے کا نتیجہ تھی

اور میں تو یہاں تک کہوں گا کہ انگریز کے تسلط کے اثرات کا نتیجہ آج بھی ہمارے سامنے ہے اور اس سے پیدا شدہ نقصانات آج بھی ہم اٹھا رہے ہیں۔ پریم چند نے بھی ان موضوعات پر خوب لکھا ہے:

> "پریم چند نے اپنے دور کے ہندوستانی سماج کی تیزی کے ساتھ تغیر پذیر روایتوں کی مصوری واقعیت پسندانہ شعار کے ساتھ کی ہے۔ متوسط طبقات کے معاملات و مسائل کی آئینہ سامانی انہوں نے انسانی دکھ درد کے مخلصانہ احساس کے ساتھ ہی ہے۔ پسماندہ اور ہریجن طبقوں کی آزمائشوں اور محرومیوں، زمیندار، سرمایہ دار، سورخوار اور برطانوی حکام کے مظالم اور تشدد کسانوں، مزدوروں اور بے روزگاروں کے مسائل، سیاسی جماعتوں اور لیڈروں کی استحصال پسندانہ سازشیں اور فرسودہ مذہبی رسم ورواج سے پیدا ہونے والی گمراہیاں پریم چند کے ناولوں کے اہم موضوعات ہیں"(۶۵)

حفیظ خان بھی پریم چند کی روایت پر عمل کرتے دکھائی دیتے ہیں، غریب اور سرمایہ دارانہ نظام کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا اور غریب کی زندگی پر سرمایہ دار کس طرح حاوی ہے اس کو واضح کیا ہے کہ ایک غریب کس قدر مشکلات کا سامنا کرتا ہے اور جاگیر دار اس کی زندگی کو کس قدر بے معنی سمجھتا ہے کہ جس کی حیثیت سوائے دو وقت کے روٹی کے سوا کچھ نہیں۔

سنگری بہت حسین ہے اور اس کی خواہش محض جنسی آسودگی حاصل کرنے کی نہیں اسے اپنے حسن کی طاقت کا اندازہ ہے اور وہ یہ چاہتی ہے کہ اسے کوئی طاقت کے زور پر ہی تسخیر کر کے حاصل کرے مگر ایسا کرنے میں اس کی اَنا کو پامال نہ کرے۔ وہ فتح ہونا چاہتی ہے مگر جب وہ منکوح سیدے کے ہاتھوں اس خواب کی بھیانک تعبیر دیکھتی ہے تو خود کو ایسے آدمی کے سپرد کر دیتی ہے جس کی پہلے سے تین بیویاں ہیں اور جو کسی بھی طرح سے اس کا حقدار نہیں۔ ایسا کر کے وہ معاشرے سے انتقام لیتی ہے جس نے اسے اس حال کو پہنچایا اور اپنی تخلیقی طاقت کو تخریبی مقاصد کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ سلسلہ بلآخر آدم واہن کی تباہی پر منتج ہوتا ہے۔ آدم واہن کی تباہی گو براہ راست سنگری کی وجہ سے نہیں ہوتی مگر تخریب کے اس تسلسل میں اس کی موجودگی بہت اہم ہے

محمد حفیظ خان نے تاریخ کا ایک ایسا دور چنا جس میں ایک کمزور تہذیب ایک طاقتور تہذیب کی زد میں ہے۔ اس طرح اس ناول کا انسان سے علاقہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ مذہبی اعتقادات، رسومات اور عبادات زرعی دور کی پیداوار ہیں۔ خدا کا اساطیری تصور بھی اسی دور سے آغاز ہوا۔ جیسے جیسے زراعت کی تہذیب آگے بڑھتی

گئی اور اس تہذیب کے زیر سایہ دیگر علوم پروان چڑھے تو خدا کے تصور میں بھی ترامیم ہوئیں۔ ایسے معاشرے میں جو طبقاتی تقسیم نظر آتی ہے اس میں جاگیر دار اور مولوی، پادری یا پنڈت بہت طاقتور ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی ڈھال کے طور پر کار فرما رہتے ہیں۔ یہ دونوں طاقتیں اپنے گرد اعتقادات اور وسائل کی طاقت سے ایسا مضبوط اور محفوظ حصار باندھ لیتے ہیں جس سے عوام الناس ان سے دور رہتے ہیں اور کوئی سوال نہیں کر سکتے۔ بستی آدم واہن کا بیانیہ اسی کشمکش سے متعلق ہے۔

حوالہ جات

1۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی(مرتبہ)کشاف تنقیدی اصطلاحات(طبع دوم)،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،۱۹۸۹ء،ص۱۷۱

2۔ محمد افضال بٹ،ڈاکٹر،اردو ناول میں سماجی شعور،پُورب اکادمی،اسلام آباد،۲۰۰۹ء،ص۱۴

3۔ انور سدید، ڈاکٹر،اردو ادب کی تحریکیں(ابتدائے اردوسے ۱۹۷۵ءتک)،انجمن ترقی اردوپاکستان،۱۹۹۹ء،ص۱۲۹

4۔ علی عباس حسینی،ناول کی تاریخ اور تنقید،لاہور اکیڈمی،لاہور،۱۹۶۴ء،ص۲۰۲

5۔ محمد حسن،ڈاکٹر،شعر نوح،فروغ اردو،لکھنو،۱۹۶۱ء،ص۳۲

6۔ محمد افضال بٹ،ڈاکٹر،اردو ناول میں سماجی شعور،ص۲۴

7۔ سہیل بخاری،ڈاکٹر،ناول نگاری اور ناول کی تاریخ و تنقید،مکتبہ میری لائبریری،لاہور،۱۹۶۶ء،ص۴۶

8۔ ناز قادری،اردو ناول کا سفر،مکتبہ صدف،دہلی،۲۰۰۱ء،ص۱۴

9۔ محمد طاہر،ڈاکٹر،ریاست بہاول پور کا نظم مملکت،بزم ثقافت،ملتان،۲۰۱۰،ص۱۲۷

10- ایضاً،ص۱۲۸

11- ایضاً،ص۱۱۵

12۔ محمد حفیظ خان،انواسی،ملتان انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ،ملتان،۲۰۱۹ء،ص۱۵

13۔ محمد حفیظ خان،انواسی،ص۹۸

14۔ ایضاً،ص۱۳

15۔ ایضاً،ص۱۸

16۔ ایضاً،ص۱۹

17۔ ایضاً، ص۸۷

18۔ سہیل بخاری، اردو ناول نگاری، ہمالہ بک ہاؤس، دہلی، ۱۹۷۲ء، ص۳۸

19۔ محمد حفیظ خان، انواسی، ص۸۱

20۔ ایضاً، ص۸۲

21۔ ایضاً، ص۸۴

22۔ ایضاً، ص۷۵

23۔ ایضاً، ص۷۶

24۔ یوسف سرمست، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اردو ناول، نیشنل فائین پرنٹنگ، حیدرآباد، ۱۹۷۳ء، ص۲

25۔ محمد حفیظ خان، انواسی، ص۱۳۰

26۔ ایضاً، ص۱۳۰

27۔ ایضاً، ص۱۴۶

28۔ ایضاً، ص۱۴۶

29۔ ایضاً، ص۲۱۷

30۔ ایضاً، ص۲۴۱

31۔ ایضاً، ص۲۴۴

32۔ ایضاً، ص۲۴۴

33۔ ایضاً، ص۲۵۳

34۔ ایضاً، ص۲۶۷

35۔ ایضاً، ص۳۰۸

36۔ ایضاً، ص۳۱

37۔ ایضاً، ص۳۲

38۔ انور پاشا، ڈاکٹر، ہندو پاک میں اردو ناول، (تقابلی مطالعہ)، پیش رو پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء، ص۹۶

39۔ محمد حفیظ خان، انواسی، ص۱۹

40۔ ایضاً، ص۲۱

41۔ ایضاً، ص۵۲

42۔ ایضاً، ص۶۱

43۔ ایضاً، ص۱۰۴

44۔ ایضاً، ص۱۰۵

45۔ ایضاً، ص۱۱۹

46۔ ایضاً، ص۱۱۵

47۔ ایضاً، ص۱۱۴

48۔ ایضاً، ص۱۵۰

49۔ ایضاً، ص۱۵۰

50۔ ایضاً، ص۱۵۰

51۔ ایضاً، ص۳۱۵

52۔ ایضاً، ص۳۲۵

53۔ ایضاً، ص۱۶۱

54۔ ایضاً، ص۱۶۴

55۔ ایضاً، ص۱۶۹

56۔ ایضاً، ص۱۷۲

57۔ ایضاً، ص۱۷۶

58۔ ایضاً، ص۱۹۱

59۔ ایضاً، ص۲۱۲

60۔ ایضاً، ص۲۲۹

61۔ ایضاً، ص۲۳۰

62۔ ایضاً، ص۲۷۰

63۔ ایضاً، ص۲۷۲

64۔ ایضاً، ص۲۷۳

65۔ اسلم آزاد، ڈاکٹر، اردو ناول آزادی کے بعد، نکھار پبلیکیشنز، ۱۹۸۱ء، ص۳۹

باب سوم

ناول "اَنواسی" کا ثقافتی تناظر میں تجزیہ

ثقافت کیا ہے؟

ثقافت عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ "ثَقَفَ" ہے جس کے معنی ہیں عقلمندی، مہارت اور دانائی وغیرہ۔ عربی زبان کے علاوہ فارسی میں بھی اس کا استعمال ہوتا آیا ہے۔ عربی میں ثقافت "فرہنگ" کو کہتے ہیں۔ جو کہ دو اجزا پر مشتمل ہے "فر" اور "ہنگ"۔ فر کے معنی ہیں آگے یا اوپر۔ یہ لفظ جب اسم سے پہلے استعمال ہوتا ہے تو چمک دمک اور عظمت اور شکوہ کے معنی دیتا ہے۔ جب کہ "ہنگ" اوستائی زبان کے لفظ تھنگا سے مشتق ہے جو کہ کھینچے، لے جانے، وزن اور بوجھ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح ان دونوں الفاظ کے مرکب (فرہنگ) کا لفظی مفہوم "اوپر لے جانا" یا باہر نکالنا ہے۔ قرآن پاک میں لفظ ثقافت کا مفہوم پانا یا تلاش کرنا کے ہیں۔ انگریزی میں ثقافت کے لیے کلچر کا لفظ رائج ہے۔ فرہنگ کارواں میں ثقافت کے مندرجہ ذیل معانی درج ہیں: "ثقافت کے معنی لطیفہ، علم و ادب، تمدن اور کسی قوم کے تصورِ حیات ہیں۔"(۱)

ثقافت دراصل نام ہے کسی قوم یا انسانی گروہ کے ان مخصوص نظریات اور عقائد، افکار و اخلاق، تہذیبی رواج و روایات، طرزِ بود و باش، اندازِ معاشرت فکری اور تخلیقی سرگرمیوں کا جو اسے دوسری اقوام سے ممتاز کرتی ہے۔ ہر قوم کی ثقافت ایک مخصوص و منفرد مزاج کی حامل ہوتی ہے اور اس قوم کے بنیادی نظریات پر منحصر ہوتی ہے۔ دنیا کی کوئی بھی زندہ و باوقار قوم کبھی اپنی ثقافت کے تحفظ سے غافل نہیں ہوتی اس لیے کہ وہ جانتی ہے کہ اس کو مٹانے والی قوتیں اس کی جڑ پر حملہ کرنے کی جرات نہیں رکھتیں وہ اس کی ثقافت پر حملہ آور ہو کر اسے مسخ کر کے اپنے لیے کامیابی کی راہ نکال لیتی ہیں، کسی قوم کی مخصوص ثقافت کا کسی دوسری قوم کی ثقافت میں گم ہو جانا اس قوم کی موت کا اعلان ہے۔ اس قوم کو خواہ دوسرے اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں لیکن وہ نہ ہی کوئی حرکت کر سکتی ہے اور نہ ہی اُسے اپنے وجود کا احساس ہوتا ہے۔ انسان اور تہذیب و ثقافت لازم و ملزوم ہیں، تہذیب و ثقافت کا انسان سے گہرا تعلق ہے۔ تہذیب و ثقافت کا انسان کے بغیر کوئی وجود نہیں اسی طرح بنا تہذیب و ثقافت انسان نہ صرف ادھورا ہے بلکہ انسان کہلانے کا بھی مستحق نہیں اس لیے کہ یہی وہ چیز ہے جو اسے باقی مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے اور اشرف المخلوقات کا درجہ دیتی

ہے۔ فیض احمد فیض اپنی کتاب "ہماری قومی ثقافت" میں ثقافت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح سے کرتی ہیں:

> "ثقافت تو ایک عمل تشخص کا نام ہے اگر آپ یہ کہیں کہ انسان کو یہ دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی کہ اس کے خدوخال کیا ہیں یا کسی کو اپنے خدوخال کا علم ہی نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی شخصیت مفقاد ہے اسی طرح قومی ثقافت زندگی سے قومیت کے وجود سے یا کسی وطن کے وجود سے الگ اور علیحدہ نہیں ہوتی وہ تو اس کا داخلی حصہ ہے۔"(۲)

جن چیزوں کو معاشرہ اہم سمجھتا ہے اور ان کی قدر کرتا ہے وہی اس کی معاشرتی قدریں ہوتی ہیں۔ ان قدروں میں عقائد شامل ہیں، معاشرے کے مستقبل کے متعلق ان کے خواب شامل ہیں۔ اسی طرح ان کی امنگیں اور امیدیں بھی شامل ہیں۔ یہ سب جو باطنی نظام ہے اچھائی اور بُرائی کا، خوب صورتی اور بد صورتی کا، سلیقے اور بد سلیقگی کا یہ سب ان کے کلچر کا باطنی پہلو ہے۔ ظاہری پہلو وہ ہوتا ہے جب وہ ان قدروں، ان جذبات اور ان عقائد کا اپنی زندگی میں اظہار کرتے ہیں۔

> "ثقافت میں زندگی کا جتنا کاروبار ہے وہ سب شامل ہے۔ لباس ہے، زبان ہے، خوراک ہے، رہائش کے طریقے ہیں، روم و رواج ہیں، آپس میں ملنے جلنے کے طریقے ہیں، زندگی کا جتنا روزمرہ ہے جس کو انگریزی میں "وے آف لائف" کہتے ہیں وہ سب زندگی کا تمام روزمرہ کسی معاشرے کے کلچر کی ناتراشیدہ صورت ہے۔ جب کوئی آدمی خاص قسم کا لباس پہنتا ہے یا خاص قسم کا کھانا کھاتا ہے اُس وقت وہ یہ نہیں سوچتا کہ میں کلچر کا کام کر رہا ہوں وہ تو غیر شعوری بات ہے۔ وہ تو روزمرہ کے طریقے سے عملی کرتا ہے"(۳)

معاشرے کے وجود کی بنیادی اکائی ثقافت ہے۔ ثقافت اپنے پیروکاروں کی اجتماعی سوچ اور ان کی اچھائیوں اور برائیوں کے اختیارات کی عکاس ہوتی ہے۔ بنیادی طور پر ثقافت اپنے اندر کسی بھی معاشرے کی تمام خوب صورتیوں کو سموئے ہوتی ہے، کوئی بھی معاشرہ اپنی ثقافت کی وجہ سے دوسرے معاشروں سے ممتاز ہوتا ہے اور ہر معاشرہ کی ثقافت منفرد ہوتی ہے جو کہ اس علاقے کے لوگوں کی تاریخ، تہذیب اور اس کے

رسم ورواج کا اعکاس ہے۔ کسی بھی معاشرے میں ایک فرد کے سیاسی، سماجی اور اخلاقی تمام پہلوؤں کی تربیت اس معاشرے کی ثقافت کے مطابق تشکیل پاتی ہے۔

> "کلچر یا ثقافت گانے بجانے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ قومی اور معاشرتی زندگی کا بہت ہی اہم شعبہ ہے۔ کلچر معاشرتی زندگی کے جملہ کاروبار پر اثرانداز ہوتا ہے، پورے طریقہ زندگی کو کلچر کہتے ہیں۔ کلچر کی اثراندازی ذہنی طور سے بھی ہوتی ہے عقائد اور نظریات کے ذریعے بھی"(۴)

معاشرے کا جو ڈھانچہ ہو گا اس کی جیسی ہیت ترکیبی ہو گی یا جیسا سوشل اسٹرکچر ہو گا کلچر تمام تر اس کے تابع ہو گا، جیسے سیاسی یا معاشرتی حالات بدلتے ہیں اس کے مطابق کلچر کے تصورات اور اس کی اشکال بھی بدلتی رہتی ہیں۔ کلچر نہ کوئی جامد شے ہے اور نہ اسے دوام حاصل ہے۔ کسی بھی معاشرے کا وجود اس کی ثقافت کے بغیر ناممکن ہے۔ ثقافت کے مفہوم کو جاں لینے کے بعد دیکھتے ہیں کہ حفیظ خان نے ناول انواسی میں بہاولپور کی ثقافت کو کس طرح اجاگر کیا ہے۔ ناول "انواسی" حفیظ خان کے نمائندہ ناولوں میں سے ایک ہے۔ اردو ناول نے جوں جوں ترقی کے مراحل طے کئے اس صنف نے اردو ادب میں اپنے اہمیت کا لوہا منوایا یوں ناول نگاری کا فن مزید مستحکم ہوتا ہوا اکیسویں صدی کی دو تہائیوں کا سفر بھی کامیابی سے طے کیا جا چکا ہے۔ محمد حفیظ خان کا ناول بھی موجودہ صدی میں اردو ناول نگاری کے حوالے سے اپنی اہمیت کو اُجاگر کر رہا ہے۔

الف۔ ناول "انواسی" میں بہاولپور کی ثقافت کی عکاسی

بہاولپور کی سرزمین کی معاشرتی زندگی ایک ایسا گلدستہ ہے جو گلہائے رنگ رنگ کے حسین امتزاج مختلف تہذیبوں کے عروج و زوال، مدنیت کے تاریخی ارتقاء اور آب و ہوا اور تغیر پذیر ماحول سے متاثر ہونے والی قبائلی یا اجتماعی زندگی کے اثرات یا تاریخ کے انقلاب آفریں سفر سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے سامانِ دلکشی بھی ہے اور دعوت جستجو بھی۔ بہاولپور کی ثقافت کے متعلق سید زاہد علی اپنی کتاب بہاولپور کی سرزمین میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح سے کرتے ہیں کہ:

> "اس ڈویژن میں جو سابق ریاست بہاول پور کے تین اضلاع بہاولپور، بہاولنگر اور رحیم یار خان پر مشتمل ہے خانہ بدوش بھی ہیں اور بڑی بڑی حویلیوں میں رہنے والے امیر زادے بھی۔ بوسیدہ قلعے بھی ہیں اور پر شکوہ محلات بھی، نخلستان بھی ہیں اور

ریگستان بھی، کھجوروں کے جُھنڈ بھی ہیں اور لہلہاتے کھیت بھی۔ خشک دریا بھی ہیں اور باغات بھی، خود سے ناآشنا گڈریے بھی ہیں اور علم و دانش کے ادارے بھی۔ اور جہاں رگ دید میں قدیم باشندوں کے اوہام کی جھلکیاں ہیں وہاں صحابہ کرام اور مختلف روحانی تحریکوں کے اماموں کے مقابر کے آثار و باقیات کی صورت میں ایمان و ایقان کی علامت بھی موجود ہیں"(۵)

بہاولپور کی سرزمین کی قدامت و جلالت، ثقافت اور معاشرتی استطابت کے پیشِ نظر اس کے باسی اپنے ماضی اور حال پر اس اعتبار سے فخر کر سکتے ہیں کہ انہوں نے مختلف ادوار میں سرخروئی حاصل کر کے اپنی استقامت اور حوصلہ مندی کی تاریخ اپنے خون پسینہ سے رقم کی ہے۔ آج تک اس رہتی سہتی دنیا میں جس قدر معاشرے وجود میں آئے ان میں سے ہر ایک کے مخصوص سماجی و ثقافتی ورثے ہوتے تھے۔ جو ان کی شناخت بن جاتے تھے ان میں ہر سوسائٹی کے طور طریقے ،رہن سہن، کھانا پینا، پہننا اور شادی بیاہ، نغمے و گیت، روایات و رسومات نسل در نسل کچھ نہ کچھ تبدیلی اضافہ یا کمی کے ساتھ اب تک چلی آتی ہیں۔ معاشرہ جس قدر قدیم ہوتا ہے اور اس کے رابطے و تعلق بیرونی دنیا سے کم ہوں گے اس قدر اس کی شناخت سماجی و ثقافتی رشتے زیادہ قدیم اور جانب دار ہوتے ہیں۔

زیرِ مطالعہ ناول "انواسی" اپنے مخصوص بیانیے، کردار نگاری اور دوسرے فنی لوازم کے ساتھ ساتھ فکری حوالے سے بھی ایک اہم تحریر ہے یہ ناول اپنے اندر بیک وقت کئی اہم عناصر کو سموئے ہوئے ہے۔ ناول نگار نے اپنے فن کے پیرائے میں ناول میں اہم موضوعات کو زیرِ بحث لایا ہے۔ ناول نگار نے جس طریقے سے کرداری، اور ان کرداروں میں اپنے مذہبی، ثقافتی اور تہذیبی ورثے کو بیان کیا ہے وہ اس کی نمایاں خوبی بن کر ابھرتا ہے، "انواسی" میں بہت سی گمشدہ اور تلخ حقیقتوں کا بیان ملتا ہے، ناول کی مجموعی فضا میں مخصوص ثقافتی رنگوں کے ساتھ ساتھ تاریخی شعور بھی ملتا ہے۔ سیاسی، سماجی حتیٰ کہ مذہبی اثرات اور وقت کے ساتھ ان میں تبدیلی کو بہت عمدہ طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔

ناول میں جنوبی پنجاب خصوصاً بہاول پور کی ثقافت کی عکاسی ملتی ہے۔ ناول میں موجود تاریخی حوالے کی بات کی جائے تو اس عہد کے لحاظ سے ناول نگار نے مرقع نگاری سے کام لیتے ہوئے اس ثقافت کے

خاص پہلو اجاگر کیے ہیں۔ ناول کا قصہ دریائے ستلج کے کنارے آباد ایک بستی آدم واہن کے گرد گھومتا ہے ان لوگوں کے ذریعے ناول نگار نے اس پوری تہذیب کا المیہ بیان کیا ہے۔ اس دریا پہ پل کی تعمیر کی غرض سے موجود انگریزوں کے بیان سے ناول نگار نے سامراجی قوتوں کی حکمرانی کو بھی عیاں کیا ہے۔ غاصب طاقتیں کس طرح محکوم لوگوں کی جان ومال سے کھیلتی ہیں، اپنی حکمرانی کو استحکام دینے کے لیے مختلف حربوں کو آزمایا جاتا ہے۔ اپنے مفادات کو ہی مقدم رکھا جاتا ہے۔ محکوم لوگوں کی عزت ہو یا جان اس کی اُن کی نظر میں کوئی وقعت نہیں ہو سکتی۔ ان کو ہر حال میں اپنے مفادات عزیز ہیں۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے وہ ان میں سے ہی لوگوں کی کی وفاداریاں، ان کی مجبوریاں اور محرومیوں کے عوض خرید لیتے ہیں، جو ان کی حکومت کو مزید استحکام اور جلا بخشتا ہے۔ ناول میں انہی عوامل کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے:

> "محمد حفیظ خان نے تاریخ کے ایک ایسے دور کا انتخاب کیا جہاں ایک طرف ایک ایسا زرعی معاشرہ ہے جس میں Primitive معاشرے کے انسان کی تہذیب کی باقیات دیکھی جاسکتی ہیں ۔یہ معاشرہ مذہبی توہم پرستی اور قبائلی طرز کی سماجی طاقت کے زیرِ اثر ہے۔ اس معاشرے میں مذہبی اشرافیہ بھی بہت طاقت ور ہے۔ دوسری طرف استعماری طاقتیں ہیں جو صنعتی قوت کے بل بُوتے پر اس تہذیب کے وسائل کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتی ہیں اور شناخت کو مٹانا چاہتی ہیں۔ پہلی تہذیب کا Anaphorn((ماقبل) پتھر کے عہد کا انسان ہے اور دوسری تہذیب کاCataphora(مابعد) آج کے صنعتی دور کا انسان۔ درمیان میں انواسی ایسی جغرافیائی اور زمانی اکائی بُنتا ہے جہاں ایک عہد دوسرے کو کچل کر آگے بڑھتا دکھائی دے رہا ہے۔ اکیسویں صدی میں یہ منظر نامہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔[۶]

ناول کا قصہ شروع ہی اسی تناظر میں ہوتا ہے کہ انگریز حکومت دریا کے کنارے آباد بستی آدم واہن کے مکینوں کے ساتھ برآزما ہے۔ کمپنی کی طرف سے ریل کا ٹریک (پٹڑی) بچھائی جارہی ہے اس میں مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب گاؤں کا قدیم قبرستان اس کی زد میں آجاتا ہے۔ بستی والوں کا اس حوالے سے شدید ردعمل سامنے آتا ہے۔ وہ کسی صورت بھی انگریزوں کو ایسا کرنے کی اجازت دینے سے گریزاں ہیں اگرچہ بستی والے جانتے کرتے ہیں کہ انگریز ان کے مقابلے میں بہت طاقت ور ہیں لیکن عقائد و نظریات تمام چیزوں پہ حاوی ہو جاتے ہیں، خصوصاً جب معاملہ مذہب اور اس سے جڑی ہوئی عقیدت کا ہو تو موت کو گلے لگانا

قبول کیا جا سکتا ہے لیکن ان عقائد و نظریات پر سمجھوتا قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے گاؤں کے لوگ اپنی جان پر کھیل کر بھی اپنے بزرگوں کی قبروں کی حرمت کی حفاظت کے لئے ہمہ تن متحد کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ اگرچہ انگریز حکومت کی طرف سے خائف تھے لیکن اکثریت مقابلے کے لئے تیار تھی۔ کچھ کا یہ کہنا تھا کہ مُردوں کی باقیات کو دوسری طرف منتقل کر دیا جائے جس سے ان کے بزرگوں کی نشانیاں باقی رہ جائیں گی۔ ناول سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"مِٹھل ماچھی کے منصوبے پر مولوی جار اللہ نے یہ کہہ کر رندا پھیر دیا کہ ایسا کرنا میت کی توہین، صریحاً کفر اور گناہِ کبیرہ ہے۔ اب مولوی کے فتویٰ کے بعد کسی کی مجال کہ کوئی اختلاف کرے لہٰذا وہاں بیٹھے ہوئے سب نے چُپ سادھ لی"(۷)

عقائد و نظریات کی راہ میں حائل تمام رکاوٹیں یا تو ٹوٹ جاتی ہیں یا پھر خود انسان ان سے ٹکرا کر ٹوٹ تو جاتا ہے لیکن وہ کبھی ہار نہیں مانتا، ان عقائد و نظریات کا تعلق خواہ مذہب سے ہو یا ثقافت سے لوگ اس کی خاطر مر مٹنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً مشرق میں ایسے نظریات پہ سمجھوتا نہیں کیا جاتا۔ یہاں بھی اس کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ بسا اوقات ان نظریات کی آڑ میں مذہبی رہنما ان سادہ لوح اور عقیدت کے ہاتھوں مجبور انسانوں کا استحصال بھی کیا جاتا ہے جو اپنے ان مذہبی پیشواؤں کے ہاتھوں نقصان اٹھاتے ہیں۔ اگرچہ مولوی صاحب کا یہ فتویٰ غلط نہیں قرار دیا جا سکتا لیکن ان کی غیر مستقل مزاجی سے لوگوں کے لئے مسائل کا ایک انبار لگ جاتا ہے، ان کی ذاتی مصلحتیں ان کے فرمانبرداروں یا عقیدت مندوں کے لئے موت کا سامان کرتی ہیں۔ اصل مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ان مذہبی پیشواؤں اور رہنماؤں کا تعلق سیاسی لوگوں سے قائم ہو جاتا ہے۔ یہ سیاسی رہنما اگرچہ مقامی ہوں یا پھر انگریزوں کی صورت میں غاصب دونوں صورتوں میں یہ گٹھ جوڑ عام سادہ لوگوں کے سماجی، معاشی اور جانی استحصال کا باعث بنتا ہے۔

بستی "آدم واہن" کا مولوی جار اللہ بھی اسی قسم کی تابیداری کی وجہ سے بے حد طاقت ور ہے۔ اس کی مذہبی ساکھ سے لوگوں کے دلوں میں جہاں اس کے احترام اور خوف کے ملے جلے جذبات ہیں وہیں اس کا تعلق انگریز حکومت کے اہلکاروں سے ہونے کے باعث وہ مزید طاقت ور بن جاتا ہے انگریزوں کو بھی اس کے ہوتے ہوئے کسی غیر معمولی مواقع کی توقع نہ تھی۔ اس لئے وہ خاموش تھے کہ مولوی جار اللہ ہی اس معاملے میں کوئی حل ضرور نکالے گا۔ گاؤں کے چند لوگ اپنی معاشی بدحالی کے باعث ویسے ہی مرغوب تھے کہ وہ کسی صورت بھی انگریز حکومت سے تصادم کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ مولوی کے فتوے نے لوگوں کے

حوصلوں کو مزید مستحکم کیا جب مذہبی رہنما کسی بات پہ فتویٰ دے دے تو پھر لوگ مرنا تو قبول کرتے ہیں لیکن اس کی بات کا لحاظ ضرور رکھتے ہیں، اسی حوالے سے ناول میں موجود ریلوے انجینئر کے ایک کردار کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> "۱۸۵۳ء میں مری ٹاون بنا مری کی گلیات میں سڑکیں بناتے ہوئے جِم بھی جان گیا کہ یہاں کے لوگ لاشوں کی حرمت کا خیال رکھیں نہ رکھیں مگر اپنے قبرستانوں کی حرمت پر مر مٹنے کو تیار ہو جاتے ہیں، اور جہاں یہ کسی مذہبی بات پر حاکمِ وقت کے خلاف اکٹھے ہو جائیں تو انہیں اپنی بات سے ہٹانا ممکن نہیں رہ جاتا"(۸)

قبرستان میں سے ریلوے لائن کے گزارنے کا معاملہ خاصا پیچیدہ تھا۔ اگرچہ انگریزوں کی طاقت کے سامنے بستی کے چند غریب لوگوں کی ایک نہ چلتی لیکن وہ اس بات سے کشمکش کا شکار تھے کہ کہیں اس چھوٹے سے واقع سے ملک گیر مسلمانوں کی احتجاج کی صورت میں مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے۔ ایسی صورت میں میں وہ مولوی جاراُللہ سے اس معاملے کے حل کی کوئی راہ نکالنے کے منتظر تھے۔ تاکہ جانی نقصان کم سے کم ہو۔ دوسری طرف بستی کے نوجوانوں کا ایک گروہ جس کی سربراہی "سیدا" نامی نوجوان کا رہا تھا ہر وقت قبرستان کی حفاظت کے لیے پہرے پہ موجود ہے۔ اگرچہ انگریزوں کے مقابلے میں ان کے پاس طاقت کم تھی۔ لیکن ان کے دلوں میں وہ جوش اور ولولہ تھا جس میں جان کی بھی پرواہ نہیں کی جاتی۔

> "برطانوی حکومت نے اپنے مفادات کی خاطر ہندوستان میں کئی چھوٹی وبڑی ریاستوں کو باقی رکھا اور ان کو اندرونی معاملات میں خود مختاری دے دی۔ ان ریاستوں کی حیثیت یہ تھی ان کے راجہ مہاراجہ اور نواب برطانوی حکومت کے وفادار تھے اور جیسا کہ مغلوں نے راجپوت حکمرانوں کو موروثی حقوق دے رکھے تھے یہی حقوق برطانوی حکومت نے ریاستوں کے حکمرانوں کو دے رکھے تھے۔"(۹)

انگریز حکمرانوں کے مطابق وہ بغیر کسی تصادم کے اس مسئلے پہ قابو پانے کے لیے پر امید تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ بستی والوں کو مغلوب کر کے یہ کام آسانی سے کر لیا جائے گا۔ دوسری طرف مولوی جار اللہ کی شخصیت بھی اتنی پر اسرار تھی کہ کسی کو بھی ان کے سامنے انکار کرنے کی جرات نہ تھی۔ مولوی جار اللہ کی صورت میں برصغیر کے ثقافتی عوامل کا بھی اندازہ ہوتا ہے ۔ یہ لوگ سادہ لوح اور خوش عقیدہ ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ باہر سے آنے والوں کے اثرات کو قبول کیا اور اس کے بدلے ان کو استحصال کا سامنا کرنا پڑا۔ لوگوں کے

دلوں میں عقیدت کا بلند و بالا تصور قائم کر کے ان کے ذہنوں پہ ایسا کنٹرول حاصل کیا جاتا ہے کہ وہ ان کی نافرمانی کو اپنے لئے باعثِ عذاب تصور کرنے لگ جاتے ہیں، یہ وہ سطح ہے جس کے بعد ان کے مذہبی پیشواؤں کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی وہ اپنے مقاصد کو بڑی آسانی سے حاصل کر لیتے ہیں:

> "مگر جب کمپنی نے سیاسی اقتدار حاصل کر لیا تو اب انہیں تاجروں سے زیادہ جاگیرداروں اور زمینداروں کی حمایت کی ضرورت تھی۔ کیونکہ اب ان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ تجارت نہیں بلکہ ریونیو تھا۔ جاگیرداروں اور زمینداروں کی حمایت کی اس لیے بھی ضرورت تھی کیونکہ ان کا اثر دیہاتی آبادی پر تھا اور وہ ان کے ذریعے رعیت کو کنٹرول کر سکتے تھے۔"(۱۰)

انگریزوں نے بستی والوں کو اپنے بزرگوں کی قبروں سے باقیات نکال کر دوسری جگہ منتقل کرنے کا کہا اور ان کے انکار کی صورت میں یہ کام خود کرنے کا عندیہ دیا۔ گاؤں کے لوگوں کا رفتہ رفتہ ملا جلا ردِ عمل سامنے آیا۔ مصلحت پسند لوگوں کے خیال میں وہ اپنی محدود طاقت و صلاحیت کے ہوتے ہوئے انگریزوں سے تصادم کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے اور دوسرا گروہ سیدے کی تقلید میں قبرستان کی حفاظت کے لئے مر مٹنے کو تیار تھا۔ دونوں طرف اس بات کا قوی امکان کیا جا رہا تھا کہ ان تصادم میں بڑا جانی نقصان ہو گا۔ بالآخر وہ دن قریب آ ہی گیا جب مردوں کی باقیات کو منتقل کرنا تھا، انگریز سرکار کی طرف سے قبرستان کا گھیراؤ کر لیا گیا اور کسی بھی لمحے میں حتمی کارروائی عمل میں لائی جا سکتی تھی۔ ایسے میں مولوی کا کردار اپنی پُراسرار رویے کے ساتھ پھر نمودار ہوا۔ مصلحت پسند گروہ انگریز کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے کوئی بھی اپنے پیاروں اور بزرگوں کی قبریں کھودنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ محبت مذہب کے ساتھ ساتھ ثقافت میں بھی شامل ہے۔ یہ خطہ ہمیشہ سے اپنی روایات کی پاسداری میں اپنی مثال آپ رہا ہے۔ دوسری طرف انگریزوں کا گروہ تھا جن کے ہاں نہ تو مذہبی قدریں باقی ہیں اور نہ ہی اخلاقی لحاظ سے وہ اتنے اعلیٰ ظرف ہیں۔ جب کہ اس خطے کے خمیر میں اپنے بزرگوں کا احترام ان کی قبروں کی بھی حرمت شامل ہے۔

انگریزوں نے حملہ کر کے قبرستان کے گرد سیدے اور اس کے ساتھیوں کا حصار توڑ ڈالا کئی جوان اس حملے میں مارے گئے۔ "سیدا" ان میں شامل نہ تھا اور نہ ہی اس معاملے میں کسی کو علم تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے، انگریز اپنے کام میں مزید تاخیر برداشت نہیں کر سکتے تھے اس لیے انہوں نے اس کام کو مکمل کرنے کے لیے بستی والوں کی مزاحمت کو بہت آسانی سے کچل دیا۔ کہوں کہ ان کی توقع کے برعکس مزاحمت بہت معمولی

تھی، جس کے ہاتھوں پنچیت کے مولوی جاراللہ نے راہ ہموار کی تھی اس واقعے کے بعد بھی مولوی نے تمام لوگوں کو اپنے رتبے کے رُعب تلے دبا دیا۔

"نماز کے بعد مولوی صاحب نے نہایت مدلل انداز میں لوگوں کو تحمل سے رہنے کی تلقین کرتے ہوئے انہیں حاکموں کی اطاعت کا فریضہ یاد رکھنا، ان کے مطابق حاکم کی طرف سے کہا جانے والا ہر کام لائق ستائش ہے کہ جس میں خلق کی بھلائی مضمر ہو ایسے امور میں رکاوٹ ڈالنا اور لوگوں کو اس کے خلاف بھڑکانا کھلی بغاوت ہے۔ جس کی کوئی بھی سزا دی جا سکتی ہے۔ لوگوں کی وہ اکثریت جو سیدے اور اس کے ساتھیوں کے مخالف رہی تھی، مولوی صاحب کی گفتگو سے بہت خوش ہوئی مگر ان کے چہرے سوال بن کر رہ گئے جو اس سے قبل ان کا فتویٰ انہی کی زبانی سن چکے تھے۔ انہیں لگا کے بستی کا کنٹرول گورا فوج کے ہاتھ میں نہیں بلکہ مولوی صاحب کے پاس آ چکا ہے"(۱۱)

یہ بات اپنی جگہ درست تھی کہ مولوی جاراللہ میں بھی انگریزوں کے خلاف مزاحمت کی قوت نہ تھی لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ مولوی نے نہ اپنی مذہبی حیثیت تک کو اس طرح استعمال کیا کہ ذاتی طور پہ انگریزوں کے ساتھ وفاداری کر کے عام لوگوں کا استحصال کروا رہا تھا۔ مولوی جار اللہ کی ایک ساکھ تھی جس کا وہ غیر ضروری استعمال کر رہا تھا۔ مولوی نے بیس نوجوانوں کی ہلاکت کے باوجود بستی والوں کو ذہنی طور پر اس طرح استعمال کیا کہ وہ بجائے غصہ اور مزاحمت میں آنے کے وہ پہلے سے زیادہ مغلوب ہو گئے۔ نو آبادیاتی نظام نے اپنی حکمرانی کو ایسے ہی اصولوں پہ استوار رکھا کہ مقامی لوگوں کو آپس میں الجھایا ان کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کیا۔ انگریزوں نے برصغیر جیسے عظیم خطے کو اسی اصول(Dived and pule) کے تحت زیر کیا اور صدیوں اس پر حکمرانی کی اس حوالے سے کمپنی کے ایک افسر کیپٹن البرٹ کے الفاظ کے مطابق:

"انتظامیہ کو کبھی انڈر اسٹیمیٹ نہیں کرتے۔ اس کے کام کرنے کا اپنا طریقہ کار اور اپنا انداز ہوتا ہے۔ اس میں اُتال نہیں کی جاتی بلکہ دشمن کے خود ہی اپنے جال میں پھنسنے کا انتظار کیا جاتا ہے اور ہاں صبح دیکھنا قبرستان کو ہم نہیں بلکہ خود ان لوگوں نے مسمار کرنا ہے کہ جو اس کے باقی رہنے کے لیے اپنی جان دینے کو تیار تھے"۔(۱۲)

اس بیان سے ظاہر ہو رہا ہے کہ انہوں نے ایسے رہنماؤں اور مذہبی ساکھ کے حامل افراد کو اپنا آلہ کار بنایا ہے جنہوں نے ان کی حکومت کو دوام بخشا۔ اپنے ذاتی فائدے کی غرض سے لوگوں نے اپنے ہی لوگوں کی

زندگیوں کا سودا کیا، ہماری گفتگو کا اصل محور مذہبی رہنماؤں کا منفی کردار یا مذہبی زبوں حالی ہے۔ مولوی جار اللہ نے اپنے مذہبی منصب کو استعمال کرتے ہوئے جب چاہا فتویٰ صادر کر دیا۔ اس کو اس نے اپنے اور انگریزوں کے مقاصد کے لئے استعمال کیا، یہ رویہ جہاں بہت سے لوگوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے وہیں مذہب کی غلط تفہیم کی صورت میں بھی سامنے آتا ہے۔ ان لوگوں کے ذاتی مقاصد کی آڑ میں مذہبی تعلیمات بھی شکوک و شبہات کی زد میں آجاتی ہیں۔ بیس نوجوان کے قتل کے باوجود مولوی نے اس کو نہ صرف غلط رنگ دیا بلکہ بستی والوں کو انگریزوں کی تابعداری پر مجبور کیا، یہاں تک کہ اس نے ان نوجوانوں کی موت جو دراصل ایسے مذہبی اور ثقافی ورثے کے اصل محافظ تھے کو حرام قرار دیا۔

> "میرے نزدیک انہوں نے خودکشی کی ہے اس لیے ان کا جنازہ بھی جائز نہیں۔ انگریزوں کی طاقت سے ٹکر لینا کہاں کی عقل مندی ہے۔ خودکشی ہی تو ہے۔ تم لوگ بھی کوئی عقل کرو خودکشی نہ کرو۔۔۔۔ اور ہاں جیسے ہی پُو پھوٹتی اور دن نکلتا ہے تو تمام بالغ پرانے قبرستان پہنچ کر اپنے وڈکوں کی قبروں سے ان کی نشانیاں نکال کر نئے قبرستان میں عزت و آبرو کے ساتھ دفنا دیں۔ بس ایک گھنٹہ ٹائم ہو گا اس کے بعد کسی کی بات نہیں سنی جائے گی۔ مشینیں موقع پر آچکی ہیں، پھر میں کیا بتاؤں؟ آگے خود سمجھ دار ہو مولوی جاراللہ نے تو اپنا فرض ادا کر دیا باقی رہنے والا نام اللہ کا"[۱۳]

مولوی صاحب کے فتویٰ نے انگریز حکومت کی یہ مشکل آسان بنا دی۔ بالآخر انتظامیہ کی موجودگی میں بادل ناخواستہ اپنے پرکھوں کی قبر کشائی لوگوں نے زخمی دل سے شروع کی۔ مولوی صاحب کی بات سے کس کی مجال کوئی انکار کرتا نہ چاہتے ہوئے بھی کسی کی جرت نہ تھی لوگ بیک وقت تین عذابوں کو اپنی جان پہ برداشت کر رہے تھے، اپنے بزرگوں کی قبروں کی یوں پامالی، مولوی کے فتویٰ کے ہاتھوں مجبور اور انگریز حکومت کے سامنے یوں بے بسی۔ ایسا ہونا اس وقت معمولی بات بن جاتی ہے جب حکومت کی بنیاد ہی ظلم و بربریت پر قائم کی جائے۔ فاتح اگر عادل ہو تو دوسروں کے مذہبی جذبات کو ملحوظِ خاطر رکھ کر ان کے جذبات کو مجروح کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔ لیکن جب اس کی بنیاد ہی ظلم اور غاصبیت پر قائم ہو تو پھر بجائے اس تقدس کا لحاظ رکھنے کے ان کے تقدس کو پامال کر کے مفتوع قوم کے دلی جذبات کو ٹھیس پہنچا کے اسے باعثِ حظ سمجھا جاتا ہے۔

"آدم واہن میں ہونے والے آپریشن نے محض ایک قبرستان اکھیڑ کر بستی کے ہر گھر میں قبرستان بنا دیا تھا۔ بستی میں امن کی خبریں رکھنے والوں کو گماں بھی نہ تھا کہ بیس لاشیں تو ان نوجوانوں کی دفن ہوئیں جو گورے فوجیوں کی اچاچیت حملہ آوری کا نشانہ بنے لیکن ان سے ہٹ کر وہ کون سا گھر تھا جس کے وڈکوں اور اقرباء کی مدفون لاشیں ایک ذلت آمیز مہاجرت کا شکار نہ ہوئی ہوں"(۱۴)

مولوی کا کردار منفی ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ مثبت تاثر بھی رکھتا ہے۔ اگر وہ لوگوں کو مزاحمت سے نہ روکتا تب بھی انگریزوں نے اپنے ارادے سے باز نہیں آنا تھا۔ مولوی کا اصل روپ یہ ہے کہ اس نے مذہب کے نام پہ لوگوں کے دلوں میں اپنی ڈھاک بٹھار کھی تھی، اس کی اپنی علمیت اس قابل نہ تھی کہ وہ تمام معاملات کو سمجھ سکے۔ مولوی کے فتوے مصلحتوں پہ مبنی ہوتے۔

اس واقعے کے بعد سیدے کی کسی کو خبر نہ ہوئی وہ زندہ ہے یا مردہ اس بارے میں محض قیاس آرائیاں تھی اس کے سوا حقیقت کچھ نہیں تھی۔ سیدے کی سنگری نامی لڑکی سے بچپن میں بات چلی تھی جسے عرفِ عام میں نکاح کا نام دیا جاتا تھا جو بچپن میں ہی ہو چکا تھا۔ یہ لڑکی اپنی خوبصورتی اور ناز و ادا کے لحاظ سے گاؤں کی نمایاں لڑکیوں میں سے تھی، جسے دیکھ کر گاؤں کے نوجوانوں سمیت بڑے لوگوں کے دلوں میں بھی اس کی خوب صورتی کے خوب صورت خیال آتے لیکن سیدے کی منکوحہ ہونے کی وجہ سے کسی کو اس کی طرف دیکھنے کی بھی ہمت نہ تھی۔ قبرستان میں آپریشن سے قبل سیدہ سنگری کی طرف سے کی گئی بے عزتی کے بدلے کے لئے اسے اٹھا کر لے جاتا ہے۔ اسے اپنا حق سمجھ کر اس کی انا کو ٹھیس پہنچا کر اپنی اَنا کو تسکین دینا چاہتا ہے۔ سنگری کے ساتھ رات گزار کر وہ اسے پھینک کر چلا جاتا ہے۔ اس معاملے میں وہ خاموش رہتی ہے۔ لیکن اصل مسئلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب اسے اپنے رحم میں ایک بچے کا وجود محسوس ہوتا ہے معاشرے میں اس کا انجام کیا ہو گا اس کو سوچ کر وہ ڈر جاتی ہے کہ وہ کیسے معاشرے کے سوالوں کا جواب دے گی۔ کیا ایسے میں وہ معاشرے میں زندہ بھی رہ سکے گی۔ یہاں عورت کا استحصال بھی دکھائی دیتا ہے۔

سنگری اس موقع پر کسی حد تک عقل مندی سے کام لیتی ہے۔ یہ اس کی مجبوری بھی ہے کیوں کہ اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی اور چارہ بھی نہیں ہے۔ وہ اپنا مزید استحصال کروانے کے بجائے ایک ہی بار کسی بااثر شخص کے نکاح میں جا کے خود کو محفوظ بنانا چاہتی ہے۔ تاکہ لوگ اس کو نہ تو کوس سکیں اور نہ ہی اس کے کردار کے بارے میں بول سکیں۔ مولوی صاحب ہی اس کو اس مسئلے سے بچا سکتے تھے۔ اس لیے بھی کہ مولوی

صاحب اس جیسی لڑکی کے وصال سے کیسے انکاری ہو سکتے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا یہ وار خالی نہیں جائے گا اور مولوی جار اللہ اس سے انکار نہیں کر سکے گا۔ وہی فتوے سے اس کو بدل سکتا ہے کہ بچپن کا نکاح باطل ہوتا ہے۔

"سنگری نے مولوی صاحب کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں دبا دیا۔ سید اتو مر کھپ گیا قبر کا نام ونشان بھی نہیں، تو کیا کروں۔۔۔۔ میں تو آپ سے نکاح کرنا چاہتی ہوں، آج بلکہ اسی وقت۔۔۔۔ تو بتائیں ناں! کیا میرا نکاح ہوا تھا سیدے کے ساتھ یا صرف دعائے خیر ہوئی تھی"(۱۵)

مولوی صاحب اس اچانک وار کے لیے تیار نہ تھا اور ویسے بھی اس حیثیت کے لوگ عموماً ایسے کام کرنے سے گریزاں ہی رہتے ہیں۔ عورت کے ساتھ کھیلنا تو ان کا پسندیدہ مشغلہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ عورت کو عزت کا مقام دے کر اپنانا چاہیں تو بہت سی مصلحتیں ان کے آڑے آجاتی ہیں۔ دوسری طرف معاشرے کا تضاد بھی کھل کر سامنے آتا ہے کہ وہ حلال کاموں کی راہ میں میں زیادہ روڑے اٹکاتا ہے۔ اس کو مذہبی لحاظ سے قبولِ عام حاصل ہو بھی تو من گھڑی رسم و رواج اس کی راہ میں رکاوٹ کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ مولوی جیسے متضاد شخصیت کے حامل افراد لوگوں کی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ سنگری کے پہلے تقاضے کے بارے مولوی کو گمان بھی نہ تھا اس لئے وہ گھبرا گیا لیکن سنگری پھر بھی اس کو ایسے معافی دینے والی نہ تھی۔

"میں کیوں کروں نکاح تمہارے ساتھ؟ تمہاری عمر کی تو میری ڈوتریاں پوتریاں ہیں۔ مجھے لحاظ آتا ہے۔ آہا۔۔۔۔ اُس وقت کیوں نہیں آتا لحاظ جب آتے جاتے ہیں مجھے میرے بت کی ایک ایک بوٹی تاڑتے رہتے ہو کہ کہاں کہاں ماس زیادہ ہے اور کہاں کم۔۔۔۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ حرام کرنے میں لحاظ نہیں آتا اور حق حلال کرنے میں خوف آنے لگتا ہے اور لحاظ بھی"(۱۶)

سَنگری کی یہ گفتگو معاشرے کی منافقت کو عیاں کرتی ہے، سنگری اس گفتگو سے مولوی کو بھی زیر کرنا چاہتی ہے اور وہ اس مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتی ہے۔ ایسے بظاہر نیک صفت انسان اپنے قول و فعل میں تضاد رکھتے ہیں، ایک طرف ان کی خواتین گھروں میں باپردہ موجود ہوتی ہیں، اور دوسری طرف وہ دوسروں کی عورت کو اپنے تصرف میں لاتے ہیں۔ مولوی جار اللہ جیسے لوگ مذہب کے نام کو اپنے لیے استعمال کرتے ہیں

ہیں۔ جہاں ذاتی فائدہ نظر آیا اس کے مطابق لوگوں کے عقیدے کو بھی پھینک دیتے ہیں۔ لوگوں کی کم علمی اور خوش اعتقادی ان کے کام کو آسان بناتی ہے۔ اور یوں یہ بڑے آسان طریقے سے اپنے ہدف تک پہنچ جاتے ہیں۔ سنگری کے معاملے میں بھی مولوی جار اللہ کی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ اپنے پڑھائے ہوئے نکاح کے دعوے سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ مولوی کے کردار کو مصنف نے ناول میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے جس سے مولوی کی اصلیت کُھل کر سامنے آتی ہے:

> "کون بدبخت کہتا ہے کہ تمہارا نکاح ہوا تھا سیدے کے ساتھ؟ بچپن کا نکاح بھی کوئی نکاح ہوتا ہے۔ وہ تو صرف دعائے خیر تھی اور اس کی کیا حیثیت !تم آزاد ہو جہاں مرضی آئے شادی کرو۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔۔۔۔بے شک مجھ سے کر لو۔۔۔۔ آخری حصہ مولوی صاحب نے اتنے آہستہ سے کہا کہ صرف سنگری نے سنا تھا وہ مسکراتے ہوئے دوبارہ موڑھے پر بیٹھ گئی۔"(۱۷)

بالآخر مولوی جاراللہ سنگری کو اپنے نکاح میں لے لیتا ہے، اگرچہ اس تمام معاملے میں سنگری کا پلڑا بھاری رہتا ہے۔ سنگری اسے اپنی مرضی کے مطابق چلاتی ہے، مولوی جار اللہ جس سے تمام بستی بلکہ علاقے کے لوگ بات کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ایک نوجوان منہ زور لڑکی کے آگے بے بس ہو جاتا ہے۔ سات ماہ بعد بچے کی پیدائش ہوتی ہے، مولوی بھی عمر رسیدہ اور تجربہ کار آدمی ہونے کے باوجود بول نہیں سکتا کہ دنیا والوں کو کیا منہ دکھائے گا کہ بیوی نے ایک حرام اولاد کو جنم دیا ہے، یوں خاموشی سے اسے اپنی اولاد قبول کر لیتا ہے۔ مولوی کی دوسری بیویوں کو اس حوالے سے گفتگو کا موقع ملتا ہے لیکن وہ لحاظ کی وجہ سے بات نہیں کر سکتیں۔

ب۔ ناول انواسی میں مجموعی ثقافت کی نوعیت اور مقامی مسائل

ناول انواسی میں بہاولپور کی ثقافت کے بہت سارے نقوش ملتے ہیں ناول انواسی میں حفیظ محمد خان نے ایک خاص خطے کی ثقافت کو بھرپور طریقے سے اُجاگر کیا ہے۔ بعض اوقات ثقافت کے رسم ورواج اور رہن سہن کے معاملات مذہبی معاملات پر بھی حاوی ہو جاتے ہیں اور ان مذہبی اور ثقافتی عوامل کے ملاپ سے جو جذبات اور عقیدے پروان چڑھتے ہیں وہ بعض اوقات تمام دوسری چیزوں سے زیادہ مضبوط بن جاتے ہیں۔

> "مسلمان اپنی معاشرت کے شعائر کو مقدس مانتے تھے کیونکہ ان کی اساس اسلامی عقیدوں پر تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی مدِ نظر تھا کہ دوسروں کی معاشرت کی تقلید کا

مطلب ان کے غلبے کو تسلیم کرنے کے مترادف اور ان کی معاشرت کو حقیر اور غیر معیاری مان لینے کے برابر ہو گا۔ اور یہ انگریزوں کے تسلط کو مستحکم کرنے کا باعث ہو گا۔"(۱۸)

ناول میں بھی اسی طرح کے کچھ مسائل نظر آتے ہیں جب مقامی لوگوں نے قبرستان میں سے چالیس درویشوں سے منسوب قبروں کے حوالے سے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ باقی لوگوں کی وابستگی بھی اپنی جگہ لیکن ان چالیس درویشوں کی اصل حقیقت یہ ہے کہ اس قبرستان میں موجود چالیس درویشوں کی قبروں سے عقیدت نہ صرف اہل اسلام کے لوگوں کی تھی بلکہ بہت سارے دوسرے مذاہب کے لوگوں کی بھی ان کے ساتھ عقیدت موجود تھی۔ اسی عقیدت کی بنا پر وہ اس بات کو قبول کرنے کو تیار نہ تھے کہ کوئی ان کی مقدس ہستیوں کی قبروں کو اس طرح سے اجاڑ دے۔ ناول میں اس بات کا تذکرہ بھی ہو چکا ہے کہ وہاں پر لگنے والے میلے میں ہر مذاہب کے لوگ شامل تھے ہندو اس کو اپنا رہنما مانتے تھے مسلمانوں ان کو اپنا پیشوا مانتے تھے اور اسی طرح دوسرے مذاہب کی عقیدت بھی ان سے وابستہ تھی۔ یہی ثقافت کے مسائل بعض اوقات شدت اختیار کرتے ہوئے بہت سارے عام لوگوں کے استحصال کا ذریعہ بھی بن جاتے ہیں۔

قبرستان کے معاملے میں ایک فساد اس وقت کھڑا ہوتا ہے جب سال بعد عرس کے موقع پر چالیس درویش آتے ہیں اور اپنے شہیدوں کی قبروں کی عدم موجودگی ایک نئے ہنگامے کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ مذہبی اور سماجی عقائد جب مل جائیں تو ان کی آویزشیں ایک ایسے گہرے جنون کو پروان چڑھاتی ہے جس کے سامنے رکاوٹ ڈالنا بہتے دریا کے سامنے ریت کا پُل بنانے کے مترادف ہے۔ بستی اور اردگرد کے علاقے میں مختلف مسالک کے لوگ تھے۔ مولوی جاراللہ کا تعلق اسی مسلک سے تھا جو ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا تھا جو ہر سال آکر زندہ پیر کرامت کا عرس مناتے تھے۔ دوسری طرف انگریزوں کے ظلم کی داستان بھی تھی جنھوں نے اپنے منصوبے کا نقشہ نہ بدلا اور بستی والوں کا قبرستان اجاڑ دیا۔ مذہبی عقائد پہ جب چوٹ لگے تو لوگ جان قربان کرنے کو بھی نہ صرف تیار ہوتے ہیں بلکہ وہ ایسا کر گزرنے کا جذبہ بھی بدرجہ اُتم رکھتے ہیں۔

"شہیدوں کی قبروں کے ساتھ اس قسم کا سلوک بھی ہو سکتا ہے۔ افسوس کی بات تو یہ تھی کہ جن بستی والوں کو دریائے ستلج کے ہر سال عذاب سے بچانے کے لیے شہیدوں نے یہاں دفن ہونے کی وصیت کی تھی انہی شہیدوں کی قبروں کی حفاظت نہیں کی گئی۔ درویش دہائی دے رہے تھے کہ اگر واقعی شہیدوں کی قبروں کی بے حرمتی کی گئی

ہے تو اس میں اب آدم کا ٹھکانہ ممکن نہیں رہا ان کے نزدیک شہیدوں کی قبروں کی حفاظت نہ کر سکنا بھی ان کی بے حرمتی ہی تھی۔"(۱۹)

درویشوں کا رونا دھونا کہ بستی اور اس کے ملحقہ علاقوں کے لوگ جو ہر سال عرس پہ آتے تھے وہ بھی درویشوں کے گرد جمع ہو گئے۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے ان کے گرد ایک بڑا مجمع جمع ہو گیا، درویشوں کی آہ وزاری کی وجہ سے ان لوگوں کی عقیدت میں اور اضافہ ہو گیا، وہ اب اس نہج پہ تھے کہ ان کو ایک چنگاری ایک بڑی آگ میں تبدیل کر سکتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان لوگوں کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہو گیا کہ ان کی تعداد سینکڑوں تک جا پہنچی، اسی دوران مجمعے میں سے ایک سمت متعین کر دی گئی جس کا یہ ہجوم منتظر تھا۔

"اسی دوران کسی نے وہاں خبر اڑادی کہ سات شہیدوں کی قبروں کو مسمار کرا کر ان کے آثار مٹانے میں مولوی جاراللہ کا ہاتھ ہے کہ جو مخالف مسلک کے پیروکاروں کا کرنا دھرنا ہونے کے ساتھ ساتھ پیرزندہ کرامت کے میلے کو بھی پسند نہیں کرتا تھا۔"(۲۰)

ایسے موقع پر لوگ عقل اور انسانیت کے اوصاف سے محروم ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے ہر اس شخص کو دشمن سمجھتے ہیں جو ان کے بارے میں کبھی کسی رائے کا بھی قائل ہوا ہو۔ اس ہجوم کو تو ایک بہانہ چاہیے تھا جس رُخ اس کا دھارا بہہ سکے۔ ہجوم کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ لوگوں کو یہ بھی احساس نہیں تھا کہ ان کے ساتھ کھڑا شخص کبھی اس جگہ دیکھا گیا یا نہیں یوں یہ لوگ جنون کے گھوڑے پر سوار تھے اور یوں وہ انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے مولوی جاراللہ کے ہجرے کی طرف جانے لگے۔

ہجوم میں انتقام کی آگ اس طرح بھڑک رہی تھی کہ وہ ان چالیس درویشوں کو بھی وہاں قبرستان میں ہی چھوڑ کر مولوی کے حجرے کی طرف بھاگ گئے۔ مولوی صاحب حجرے میں ہی موجود تھے دیکھتے ہی دیکھتے ہجوم مولوی کے حجرے کے پاس پہنچ گیا۔ لوگوں نے پتھر برسانا شروع کر دیے، کچھ لوگ آگ جلانے کے لیے گھاس اور جھاڑیاں بھی جمع کرنے لگے چند لمحوں بعد آگ کے شعلے ہر طرف بھڑک اٹھے۔ کچھ لوگوں نے آگے بڑھ کر مولوی کو ہجوم سے باہر کھینچا اور اس پر ڈنڈے برسانے شروع کر دیئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مولوی صاحب کو جان سے مار دیا۔ یوں ایک بااثر طاقت ور انسان چند لمحوں بعد ایک لاش کی صورت میں پڑا تھا وہ بھی بغیر کسی وجہ کے۔ دروغہ کے آنے پہ وہ لوگ منتر ہو گئے۔

"داروغہ اپنی پاؤں کے ساتھ موقع پر پہنچا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ بستی کے لوگ اس قدر وحشی بھی ہوسکتے ہیں۔ خدا کی پناہ کہ محض پاؤں کی پے در پے جذبات سے ایک جیتے جاگتے انسان کو کچلے ہوئے گوشت کی ڈھیری بنادیا گیا تھا۔ مولوی صاحب کے سوختہ حجرے کی دالان میں پہنچا تو وہاں مولوی صاحب سمیت گیارہ جلی ہوئی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔"(۲۱)

مولوی کی یوں موت المناک المیہ ہے۔ مولوی کی عزت و تکریم کرنے والے لوگوں نے ان کے زنان خانے کو بھی جلادیا۔ لیکن اصل محرک اس کے پیچھے وہ طاقتیں تھیں جو مذہب کی آڑ میں ان لوگوں کے اندر اس قدر شدت پسندی اور انتہا پسندی پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ اس کے ساتھ جنون کی حد تک یہیں طاقتیں ان کے درمیان پھوٹ دلوا کر ان کا استحصال کرتی ہیں۔ یوں مولوی کو مارنے والے لوگ بھی کبھی کوئی نہ سمجھ سکا کہ وہ کون تھے کیوں کرتھے اور ان کے مقاصد کیا تھے۔ مولوی کے مر جانے کے بعد اس کی وراثت اور جانشینی کا مسئلہ پیش آیا اور سنگری کو بھی پھر سے ایک محافظ کی ضرورت محسوس ہوئی۔

مذہبی زبوں حالی اور تضادات کے تناظر میں ناول میں دوسرا اہم کردار مولوی اللہ بخش ہے، مولوی اللہ بخش مولوی جار اللہ کے بعد اس کا جانشین بن جاتا ہے۔ جو مولوی جار اللہ کے چھوٹے بھائی کا تقریباً ہم عمر تھا لیکن اس کا اثر و رسوخ اس سے زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ اس مقام کو سنبھال لیتا ہے، مولوی بخشو بھی دوسرے لوگوں کی طرح اس بات کا یقین رکھتا تھا کہ سنگری نے اس کے باپ کے سر پہ حرام کا بچہ تھونپا ہے۔ مولوی بخشو نے آہستہ آہستہ سنگری کی خبر گیری کے لئے آنا شروع کر دیا۔ مولوی بخشو کا رفتہ رفتہ آنا بڑھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں حیوانیت اُبھر کر سامنے آرہی تھی۔ سنگری کے لئے اب نئے امتحان کا وقت تھا۔ مولوی بخشو میں حیانہ تھی کہ یہ اس کے باپ کے نکاح میں تھی اور اس لحاظ سے اس کا درجہ ماں کا تھا۔ بے شک وہ عمر میں کم تھی، اس کا بیٹا حرام کا ہی سہی لیکن اس کی تو ماں تھی لیکن وہ تمام حدوں کو پار کر رہا تھا۔ مولوی بخشو سنگری کے بیٹے کو اپنے باپ کا بیٹا نہ سمجھ کر اسے اپنے جال میں پھنسانا چاہتا تھا۔

"مولوی اللہ بخش جیا جیا اور جیول جیول کر پوچھتا کہ ہئیں جی! سنا تو یہ تھا کہ چھ ماہیا بچہ بچ نہیں پاتا۔۔۔ مگر یہ امانت ہے بہت خوش قسمت کہ چھ ماہیا پیدا ہو کر بھی ماشااللہ بچ بچا گیا ہے۔ سنگری جونہی چوٹ کھا کر اس کی طرف دیکھتی تو وہ ڈسنے والے انداز میں مسکرا دیتا۔ ویسے ماشاءاللہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ چھ ماہیا پیدا ہوا ہے۔۔۔ قدبُت سے تو

پورا پکانو مہینے کا۔ پھر مزید زہر انڈیلنے کے واسطے مسکراہٹ کچھ اور گہری کر لیتا ہے۔ ویسے اللہ بخشے حضرت والد صاحب بھی خوب تھے صلہ رحمی میں تو حد سے گزر جاتے تھے"(۲۲)

مولوی بخشو اپنی حیثیت کو استعمال کرتے ہوئے اس بے سہارا لڑکی کا استحصال کرنا چاہتا تھا، وہ جانتا تھا کہ اختیار اس کے ہاتھ میں ہے وہ جو بھی کہے گا اسے سچ مانا جائے گا۔ اور مجبوری کی وجہ سے وہ اس کی بات ماننے کو تیار ہو جائے گی۔ مولوی بخشو نے اگر اس کے بیٹے کو حرام ثابت کر دیا تو پھر کوئی بھی اس کو سچا نہیں مانے گا۔ سنگری کے لیے یہ صورت حال بہت پیچیدہ ہے۔ اگر وہ اس کی خواہش کی تکمیل کرتی ہے تو بھی اپنا استحصال کرواتی ہے اور اگر اس کی بات کا انکار کرتی ہے تو بھی اس کے لیے اپنے بیٹے کو اور خود کو بچانا ممکن نہیں۔ عورت کے سر پر جب تک کسی مرد کا ہاتھ نہ ہو لوگ اسے چیل کوے اور گدھ کی طرح نوچ کھاتے ہیں بلکہ ہر معاشرے میں عورت کا یہی حال ہوتا ہے۔ مشرقی ثقافت میں تو مرد اس کی ڈھال بنتا ہے اگر مرد معاشرے میں طاقت کی علامت ہو تو وہ بُری عورت کو بھی اپنے پروں میں یوں چھپالیتا ہے کہ کسی کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ اسے ایک نظر دیکھ لے۔ یہاں سنگری کا سامنا اس کے مرحوم شوہر کے بیٹے سے تھا۔ مولوی بخشو انسانیت کے معیار سے گر چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہوس نے اسے اندھا کر دیا تھا۔ مولوی بخشو امانت (سنگری کا بیٹا) کو راستے سے ہٹا کر وراثت میں اس کے حق کو بھی ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس تمام صورت حال کے پیشِ نظر کہ سنگری یا اُس کی ماں کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ کوئی اس کی خبر گیری کرنے کو تیار نہیں ایسے میں بخشو کی طرف سے دی جانے والی دھمکیاں اس کو مزید مجبور اور بے بس کر رہی تھیں۔

سنگری نے ان حالات سے کسی حد تک نکلنے کے لئے مولوی بخشو کی طرف امیدانہ نگاہ سے دیکھا۔ تو مولوی بخشو بہت خوش ہوا، اس کا آنا جانا بھی بڑھ گیا اور اس کے ساتھ ساتھ گھر میں اناج اور ضرورت کی دوسری اشیاء کی بھی کثرت ہونے لگی۔ بخشو بڑے اہتمام سے ان کی ضروریات کا خیال رکھنے لگا۔ اس تمام صورت حال سے سنگری بھی سکون میں نہ تھی اور نہ ہی اس کی ماں کیوں کہ وہ مرد جو اپنی خواہش کا غلام بن کر اپنے مرحوم باپ کی بیوہ پہ نگاہ جمائے بیٹھا تھا اس سے کبھی بھی خیر کی توقع کرنا سراسر بیوقوفی تھی۔ ماں کے کہنے پہ سنگری نے یہ جواب دیا کہ وہ کبھی غلط راستے کا انتخاب نہیں کرے گی لیکن اس کے سوا اس کے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ لیکن وہ اسے اپنی حد تک محدود رکھے گی لیکن عورت بظاہر جتنی بھی مضبوط ہو ایسے حالات میں اس کی مجبوریوں کو اس کے گرد ایک جال کی طرح یوں بُنا جاتا ہے کہ وہ اسی میں پھنس کر بے بس

ہو جاتی ہے۔ وہ چاہے بھی تو اس جال میں اپنے پر پھڑ پھڑانے سے بعض رہتی ہے کیوں کہ وہ جانتی ہے کہ یہ سب بے سُود ہے اس پہ اختیار اب شکاری کا ہے وہ چاہے تو اسے آزاد کر دے جو عموماً ہوتا نہیں اور چاہے تو اس کے پر کاٹ کر اسے بے بس کر کے اس کی بے بسی کا تماشا دیکھے۔

"ملوکاں کچھ دیر تک تو سنگری کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی وہ بھی بیٹی کے سر کے سیک سے سمجھ رہی تھی کہ کہنے کو تو وہ بہت کچھ کہہ گئی ہے مگر بالکل ہی بیل، اصلوں کملی اسے اپنے کیے پر بھی اعتماد نہیں وہ نہیں جانتی کہ مرد ذات کتنی شاطر ہے یہ مینا مکار اپنا نقصان کر کے بھی فائدے میں رہتا ہے خود کٹ کر بھی عورت کو لوٹ لیتا ہے۔ یہ ہر چیز داؤ پر لگا دیتا ہے گھر بار، عہدہ سرکار، ملک بادشاہی حتیٰ کہ اپنا آپ بھی محض اس عورت کی چمڑی تک رسائی کے لیے کہ جس کی صورت اس کی آنکھ کے نقشے میں اتر آئے یا نقش ہو جائے یہ اسے قبر تک نہیں چھوڑتا"(۲۳)

ملوکاں کے اس بیان سے اس کے معاشرتی نظام اور عورت کے استحصال کی کچھ وضاحت ملتی ہے۔ سنگری اس بات سے بے خبر ہے کہ وہ مولوی بخشو کو زیادہ دیریوں محض مسکراہٹ تک محدود نہیں رکھ سکتی بلکہ عورت کے جسمانی قرب حاصل کئے بغیر اس کو چین نہیں آسکتا۔ سنگری اور اس کی ماں کے درمیان ہونے والی یہ تکرار عورت کی اس معاشرے میں ثقافتی اور سماجی حیثیت کی وضاحت بھی ہے اور رسوم ورواج کے نام پر اس کے ساتھ ہونے والے کھیلواڑ کا بیان بھی ہے۔ مرد کو محض عورت کے حسن سے غرض جو اسے پسند آ جائے وہ اسے ہر صورت میں فتح کرنا اس کو زیر کرنا اور اس کی انا کو پارہ پارہ کرنا اپنے لئے مردانگی کا باعث یا اپنے شایانِ شان سمجھتا ہے۔

عورت کی نسوانیت کو شہوت کے جذبات میں دبا دیا جاتا ہے۔ مولوی بخشو ایک مذہبی حیثیت کا مالک ہونے کے باوجود اپنے عہدے کے برعکس ایک غیر ذمہ دار بلکہ شیطان صفت انسان کے روپ میں نظر آتا ہے، سنگری کی ماں کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ وہ کسی صورت بھی اپنے دعوے سے دستبردار نہیں ہو گا۔ وہ اس کی عزت کو تار تار کر کے ہی رہے گا اور ویسے بھی اس کا نکاح کا دعویٰ تو محض ایک بہانہ ہے ایسے لوگ عورتوں کو عزت سے اپنانے کے بجائے خفیہ طور پر ان کے ساتھ ظلم کرتے ہیں تاکہ بظاہر لوگوں کے سامنے اپنی پارسائی کو ثابت کر سکیں۔

"تو کملی ہے میری دھی! یہ مرد مویا اقرار کا ہے اور نہ ہی انکار کا اور نہ ہی اس کا کوئی سیدھا پٹھا۔ بخشو تو ہے ہی بے غیرت تو دیکھ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کو منہ دکھانے جوگی بھی نہ رہے"(۲۴)

سنگری کے لیے اب اس مشکل سے نکلنے کے لیے بظاہر کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ وہ فوراًردِ عمل کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس کے پاس نہ تو زیادہ وقت ہے اور نہ ہی اس کے متبادل کے طور پر کچھ اور کہ وہ اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر سکے۔ بخشو بھی اسی خمار میں تھا کہ باپ کی دستار سر پر رکھ کر وہ بھی خود کو اتنا ہی طاقت ور خیال کر رہا تھا جتنا کے مولوی جاراللہ تھا۔ اس بات کا یقین ہے کہ کوئی اس کے خلاف نہیں جا سکتا، سنگری جیسی کم حیثیت لڑکی کی بات کا کوئی اعتبار نہیں کرے گا۔ سنگری کو اپنی نظروں میں گرا کر وہ اپنے مقاصد کو حاصل کر لے گا۔ طاقت کے نشے میں چور یہ مذہبی رہنما تمام حدوں کو پار کر جاتا ہے۔

"سنگری نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک ایسا شخص جس کے سر پر باپ کی وراثت کی دستار بندھی ہو اپنی نفسیاتی خواہشات کے سامنے اس قدر بودا اور پست ہمت ثابت ہو گا کہ حلال اور حرام کی تمیز کھو بیٹھے گا۔ وہ جب بھی چھوٹے زنان خانے میں آتا اس کی یہی کوشش ہوتی کہ اسے سنگری کے ساتھ گفتگو کے واسطے تخلیہ مہیا ہو"(۲۵)

سنگری کو رفتہ رفتہ اس بات کا اندازہ ہو چلا تھا کہ وہ اپنی حیوانیت کی تکمیل کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔ اس تمام صورت حال میں وہ کسی سمت بھی جانے کے متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ سنگری کو اس کے ماضی کے متنازع بنانے کے ساتھ ساتھ اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بخشو اپنی حیثیت کا ناجائز استعمال کر رہا تھا جو اکثر ایک المیہ کی صورت میں نمودار ہوتی ہے، لوگوں کو بیوقوف بنا کر ان کا استحصال کرنا ان کا نسل در نسل شیوہ رہا۔ وہ اعلانیہ طور پر اس کو اپنا نہیں سکتا اور نہ ہی اس کی اجازت اسے معاشرہ دے سکتا ہے۔ لیکن وہ اس کا نکاح کسی لاچار شخص کے ساتھ کر کے اسے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔

"کیا زمانہ آگیا ہے کہ ننگے سر والی سے کوئی ہمدردی بھی نہیں کر سکتا۔ دیکھ میں تیرا کچھ نہیں لگتا مگر ہم درد تو ہوں ناں۔۔۔۔ اسی لئے کہتا ہوں کہ کسی سترے بہترے سے حق کر لو۔۔۔۔ تمہارا کام بھی سر جائے گا اور میرے پہ بھی کوئی انگلی کھڑی نہیں کرے گا ، پھر بائیں آنکھ دبا کر بولا کہ ایک کھنڈا ڈھونڈھ رکھا ہے میں نے تمہارے لئے۔۔۔۔

وہ ہے ناں کوچوان آمدو۔۔۔ چھڑا چھانڈ۔۔۔ منہ میں کوئی دانت بھی نہیں آنکھوں سے کچھ دِکھتا نہیں "(۲۶)

مولوی بخشو کا یہ بیان اس کی اخلاقی پستی کو ظاہر کرتا ہے۔ نسل در نسل یہ نام نہاد مذہبی رہنما عوام کے دلوں میں اپنی دھاک بٹھا کر ان کا استحصال کرتے ہیں۔ ان کے اس رویے کے خلاف اگر کوئی مزاہمت کرنا بھی چاہے تو وہ اسے راستے کا کانٹا سمجھ کر فوراً ہٹا دیتے ہیں۔ مولوی بخشو جیسے مذہبی رہنما مذہب کی غلط تشریح کر کے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ مولوی بخشو جب حد سے تجاوز کرنے لگتا ہے تو سنگری نے بھی اپنا ردِ عمل ظاہر کیا۔ سنگری اگرچہ حالات کی ماری ہے لیکن وہ بدکار نہیں کہ اپنے مرحوم شوہر کے بیٹے کے ساتھ ناجائز تعلقات استوار کرے۔ بخشو کی ان باتوں سے سنگری کے اندر نسائی حس بیدار ہوئی وہ مزید ذلت کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے تو پہلے بھی حرام نہیں کیا بلکہ اس کے بوڑھے باپ کے ساتھ حق نکاح کیا تھا۔ سنگری سے ذلت برداشت نہ ہوئی اور اس نے مولوی بخشو کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ وہ اپنی ذلت کو برداشت نہ کر پائی کہ اس کی رکھیل بن کر رہے۔ جس پر مولوی بخشو آپے سے باہر ہو گیا بظاہر اس کی ہمدردی کا نقاب اس کے چہرے سے اب اتر گیا اور اپنی اصلیت کو بیان کرنے لگا۔

"حرامزای گشتی! پہلے میرے پارسا والد صاحب کو خراب کرنے کی کوشش کی مگر جب ناکام ہوئی تو میرے پیچھے پڑ گئی۔ مگر میں تمھارے شیطانی باتوں میں آنے والا نہیں۔۔۔ میرا کردار مضبوط ہے۔ میں نے بہت ہی حیا کیا اس لاوارثی کو پناہ ملی رہے، بچہ حرام کا ہے تو کیا ہوا، اگر ماں باپ ہی منہ پر دانگی مل لیں تو حرام کی اولاد کا کیا قصور؟ اور مگر آج تو اس حرامن نے حد کر دی۔۔۔ میں وضو میں تھا مگر مجھ جیسے پرہیز گار پر ہی دست درازی شروع کر دی۔ اب میں نے تجھے نہیں چھوڑنا نکال باہر کرنا ہے اس گھر سے بھی اور بستی سے بھی۔ یہ شریفوں کی بستی ہے بدکرداروں کی نہیں۔ "(۲۷)

مولوی بخشو اپنے عزائم کا اظہار خود ہی کر دیتا ہے۔ جب سنگری نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا تو اس نے اُسے حرامزادی اور بدکردار ثابت کرنا شروع کر دیا۔ عموماً سماج کے اندر ایسا ہوتا ہے کہ عورت کو گناہ کی علامت قرار دینے کے باوجود اُسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ بظاہر مضبوط اور بے باک نظر آنے والی عورتوں کو جہاں یہ مذہبی اور روایتی قسم کے افراد تنقید کا نشانہ بناتے ہیں وہیں ان کی اداؤں کا دم بھرتے اور اُن کے جسموں سے لطف اٹھانے کو بھی بے قرار نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی حیوانی خواہش کی عدم

تکمیل کی صورت میں اُن کو بُرا ثابت کرنے میں اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دیتے ہیں۔ مولوی بخشو کا کردار بھی ان متضاد کرداروں میں سے ایک ہے، جو بظاہر اپنا کردار پاکیزہ ثابت کر کے دوسری طرف اپنی حیوانی صفات چھپائے پھرتے ہیں۔ طاقت وروں سے گٹھ جوڑ تو کبھی غریبوں کا استحصال یہ کردار اپنے نفسیاتی مسائل کا شکار ہوتے ہیں اور بعض اوقات اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے کسی بھی حد کو پار کر گزرتے ہیں۔ بخشو کی تمام تر کوششوں اور حربوں کے باوجود سنگری اسے اپنا استحصال کرنے میں باز رکھنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

ج۔ علاقے کی حقیقی ثقافت اور ناول کا بیانیہ

انواسی ناول اپنے اندر گہرے تہذیبی اور ثقافتی شعور کو سموئے ہوئے ہے۔ ناول نگار نے بڑے عمدہ طریقے سے ایک چھوٹی سی بستی پر محدود ناول کو پوری تہذیب کے بیانیہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ناول میں موجود دوسرے عناصر کی طرح ثقافت کے عناصر کو بھی بڑے عمدہ طریقے سے برتا گیا ہے۔ ثقافت کے معاملات اور اس سے جڑے رسم ورواج کو بڑے بہترین طریقے سے بیان کیا گیا ہے اس بستی اور اس کے رہن سہن اور سماجی معاملات کو بڑی ہی تفصیل سے بتایا گیا ہے اور بعض اوقات ثقافت کے معاملات کو بے نقاب کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ اگرچہ ناول تاریخی پس منظر میں لکھا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی تہذیب و ثقافت اور مقامی ثقافت کو سمجھنے میں بھی کافی حد تک معاونت ملتی ہے۔ انگریزوں کے آنے سے ہندوستان کی ثقافت میں اگرچہ تبدیلیاں آئیں اور بعض اوقات اس کے نقوش کو مٹانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن مقامی ثقافت نے اپنے تشخص کو برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اب اس ثقافت کی اچھائیاں اور برائیاں یہ ایک الگ موضوع ہے لیکن اس میں یہ بات ضرور تھی کہ اس نے اپنے آپ کو اپنے تشخص کو برقرار رکھا۔ استعماری قوتوں کے ظلم وستم اوراس کے مقامی ثقافت کے نقوش مٹانے کی کوششوں کے باوجود بھی مقامی ثقافت نے اپنے آپ کو کسی نے کسی صورت میں برقرار رکھنے کی نہ صرف کوشش کی بلکہ اس میں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل کی۔

ناول میں مصنف نے خوب صورتی کے ساتھ بہاول پور کی ثقافت کو پیش کیا ہے۔ مرد کی حکمرانی، مذہب کی غلط تشریح اور مذہب اور عقیدت کے پیرائے میں غریبوں کے استحصال کو بڑی عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مولوی بخشو کا منفی کردار ناول کے آخر تک موجود رہتا ہے۔ جو محض اپنے ذاتی مفادات اور آسائش کو ملحوظِ خاطر رکھے ہوئے ہے۔ ان تمام باتوں سے جس سے اس کا بظاہر مفاد جڑا ہوا نہیں مطلب کہ

اس سے اسے نقصان پہنچتا ہے تو وہ ایسے اسلامی تعلیمات کا بھی انکاری نظر آتا ہے۔ناول کا یہ کردار اپنے تمام تر مسائل کے باوجود ناول کے کینوس میں آخر تک موجود رہتا ہے۔

مصنف کا کمال یہ ہے کہ اس نے اس کردار اور اس جیسے دوسرے کرداروں کے ذریعے معاشرے میں اس طبقے کی عزت اور وقار کے ساتھ ساتھ اس کا غلط استعمال بھی عیاں کیا ہے۔یہ کردار محض اپنے مفادات کا سوچتے ہیں انسانی قدریں ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔

سنگری کو اب مولوی بخشو سے بچنے کے لئے ایک ہی راستہ نظر آیا کہ وہ مولوی اللہ رکھا جو مولوی جار اللہ کا چھوٹا بھائی اور بھتیجے مولوی بخشو سے عمر میں زیادہ بڑا نہیں تھا مولوی رکھا بھی ادھیڑ عمر کا بیوی بچوں والا شخص تھا۔ اس کی طبعیت میں کسی حد تک نرمی تھی جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مولوی بخشو نے تمام معاملات اپنے ہاتھ میں لے کر خود کو مولوی جار اللہ کا جانشین مقرر کر لیا تھا۔ سنگری نے مولوی اللہ رکھے کو خفیہ اطلاع کے ذریعے اسے چھوٹے زنان خانے میں میں بلاوا بھیجا۔ مولوی رکھا کی آمد کے بعد وہ اسے پردے میں ملی اور اس سے ہمدردی وصول کرنے کے انداز میں محوِ گفتگو ہوئی۔ مولوی اللہ رکھا ملے جلے جذبات کے ساتھ اس سے ملاقات کے لئے آیا۔اس سے قبل اس نے محض اس کے بارے میں سن رکھا تھا کہ وہ ایک پرکشش عورت ہے۔ سنگری نے اس بڑے دلکش انداز میں خوش آمدید کہا جس کی وہ توقع بھی نہیں کر رہا تھا۔ سنگری آج اپنی نسوانیت کا ایسا وار کرنے والی تھی کہ جس کی تاب لانا اس ادھیڑ عمر کے مولوی کے بس میں نہ تھا۔ سنگری جانتی تھی کہ وہ جلد ہی اسے راضی کر لے گی۔ سنگری مولوی اللہ رکھا سے مولوی بخشو کی شکایت براہِ راست کرتی تو اس کاردِ عمل اس کے حق میں بہتر نہ ہوتا اور نہ ہی مولوی اللہ رکھا کے لئے۔ عین ممکن تھا کہ وہاں دونوں میں سے ایک قتل ہو جاتا ہے دوسرا پھانسی لگ جاتا۔ سنگری کا مقصد محض اس سے چھٹکارا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اپنے لئے ایک مستقل اور مضبوط سہارا تلاش کرنا تھا، جو اسے سنبھال سکے۔اُسے راہ چلتے کتوں، چیلوں اور گدھوں جیسی صفات کے مالک انسانوں سے بچا سکے۔ ان تمام امور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس نے مولوی اللہ رکھا کو مدعو کیا تھا لیکن اس مرحلے کو طے کرنا بھی خاصا مشکل کام تھا کہ وہ اپنے مقصد کو کیسے حاصل کرے گی۔ یہاں اسے مولوی اللہ رکھا کو اصل حقیقت سے آشکار کرنے کے ساتھ ساتھ اسے اپنی سچائی کا یقین بھی کرانا تھا کیوں کہ اس کے بارے میں مولوی خاندان کی رائے زیادہ مثبت نہیں تھی۔

"سنگری نے خیر مقدمی انداز میں چہرے کو گھونگھٹ میں سے نیم نمایاں کرتے ہوئے
اسے بڑے ماچے پر بیٹھنے کو کہا اور خود لبوں پر کوئی مسکراہٹ لائے بنا ہی مسکراتی ہوئی

آنکھوں کے ساتھ گلہ کیا کہ بڑے مولوی صاحب کی وفات کے بعد اس کی طرف سے
کبھی اس بچاری کا حال تک نہیں پوچھا گیا۔ مُلا رکھے کو نا تو سنگری کے اس قدر حسین
ہونے کی توقع تھی اور نہ ہی اس کے اتنے مہربان رویے کی "(۲۸)

سنگری نے مُلا رکھے کو ان تمام حربوں سے اپنا ہمدرد اور رہنما بناتے ہوئے مؤدبانہ انداز اور جذباتی کیفیات کے سہارے مولوی بخشو کی بدنیتی کو بیان کر دیا۔ اس نے بڑی مہارت سے مولوی بخشو کی بدنیتی پر مبنی مسائل کو بیان کیا اور یہ توازن بھی برقرار رکھا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی نیا تنازع جنم نہ لے کیوں کہ بالآخر اس کا منفی اثر بھی اس کی ذات پہ ہی پڑنا تھا۔ سنگری نے تمام حالات سے مولوی اللہ رکھے کو آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کا سہارا بننے کی پیشکش بھی کر دی۔ اگر چہ یہ بات مُلا کے لیے غیر متوقع لیکن پُرکشش ضرورت تھی۔ ایک جوان خوبرو لڑکی جس پہ بستی کا کوئی بھی مرد اس کی اداؤں پہ جان قربان کرنے کو تیار ہو جائے۔ وہ گھبراہٹ کا شکار ہونے کے باوجود اس بات پر راضی ہو جاتا ہے کہ وہ سنگری سے نکاح کر لے۔ لیکن اس بار بھی قسمت سنگری کا ساتھ نہیں دیتی اور مُلا اللہ رکھا چند دن بعد مر جاتا ہے اور اس کا الزام بھی سنگری کے سر پر آجاتا ہے۔ ناول کا یہ کردار ایک عام سادہ لوح مذہبی کردار ہے۔ جس کی کوئی معاشرتی حیثیت نہیں اور نہ ہی وہ ناول میں بیان کیے گئے دوسرے مذہبی کرداروں کی طرف کسی کا استحصال کرتا ہے۔ سنگری کی خواہش کے مطابق اس نے اس کا سہارا بننے کے لیے نکاح کیا۔

مولوی بخشو کا کردار ناول کے اختتام تک موجود رہتا ہے۔ جو اپنے متنازع کردار اور شخصیت کے ساتھ موجود رہتا ہے۔ ناول کے اختتام پہ سیلاب کی وجہ سے وہ بھی تمام لوگوں کی طرح مصائب کا شکار ہو جاتا ہے۔ ناول کے اختتام پر مصنف نے ایک ڈرامائی انداز میں سیلاب کی وجہ سے تمام لوگوں کو برابر کر دیا سب اپنی بقا کی جنگ لڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں امیر و غریب کی تخصیص تو درکنار انسانیت بھی معدوم ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ مولوی بخشو جو بظاہر سنگری کا ہمدرد اور اس کے حسن کا شیدائی تھا ایسی حالت میں وہ اس سے بھی بے نیاز تھا۔ اس کا منافقانہ رویہ سب کے سامنے عیاں تھا۔ موت ایسی حقیقت ہے جو انسان کو انسان سے بے نیاز کر دیتی ہے اور شاید یہی وہ وقت ہے جب انسان کے سامنے اصل حقیقت بھی آشکار ہو جاتی ہے۔ لیکن اس وقت واپسی کا راستہ ممکن نہیں ہوتا۔ ناول میں موجود ان مذہبی کرداروں کے بیان سے ان لوگوں کے قول و فعل میں تضاد کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ یہ لوگ محض ذاتی مفادات کے حصول کے لئے مذہب کا نام استعمال کرتے ہیں،

اور بعض اوقات ان کے پاس بھی سمجھوتے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ مذہبی زبوں حالی کا عروج اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ حلال و حرام کی تمیز بھی بھلا دی جاتی ہے۔

ناول "انواسی" اکیسویں صدی میں لکھے جانے والے ان نمایاں ناولوں میں سے ہے جس میں مصنف نے اپنی ثقافت کو بیان کیا ہے۔ ناول میں انگریز حکومت کے ریلوے لائن بچھانے کے منصوبے کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اور اس کے پس منظر میں ہونے والے معاملات کو بھی ناول نگار نے عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے۔ ناول میں مصنف نے انگریز کمپنی کے انجینئر جان برٹن اور ان کی اہلیہ ایما کے بیان نے مغربی تہذیب کو بھی مختصراً بیان کیا ہے۔ بلکہ ان دونوں کے بیان سے ان میں ایک تقابلی فضا بن گئی ہے جس سے دونوں تہذیبوں کو سمجھنے میں کافی حد تک مدد ملتی ہے۔

ناول کا کینوس دریا کے کنارے آبادی بستی آدم واہن اور انگریز کمپنی کے ریلوے لائن بچھانے کے معاملات تک محدود رہتا ہے۔ ناول میں حفیظ خان نے بہاول پور کی ثقافت کو بھی بڑے عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے۔ ایک بستی کے بیان میں ہی ناول نگار نے پوری ثقافت کو بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔ ناول میں بہاول پور کی ثقافت کی ترجمانی کرتے ہوئے سماجی نظام کی تکمیل اس کی شکست و ریخت کو بیان کیا ہے۔ ناول نگار نے لوگوں کے رہن سہن سے لے کر زبان و بیان تک تمام امور کو مد نظر رکھتے ہوئے تفصیل سے اس کا بیان کیا ہے۔ مذہبی اور ثقافتی پہلوؤں کا بیان اس بات کو واضح کرتا ہے کہ مذہب اور ثقافت باہم جڑے ہوتے ہیں۔ ثقافت کا اثر بعض اوقات اتنا بڑھ جاتا ہے کہ وہ مذہبی امور پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ مذہب کے ساتھ ثقافتی پہلوؤں کو جوڑ دیا جاتا ہے۔ ثقافتی امور کو مذہب پر ترجیح دی جاتی ہے اور بالآخر وہ مذہبی رسومات کا حصہ بن جاتے ہیں۔

> "پیر زندہ کرامت دریائے ستلج کے زیریں بہاؤ سے جڑے علاقوں میں ایک زندہ روایت کے طور پر لوگوں کی عقیدت میں راسخ مقام کے حامل تھے۔ کہا جاتا تھا کہ ایک بار اس علاقے میں عجیب قسم کا قحط پڑا۔ زمینوں نے پیداوار دینی بند کر دی اس طرح کہ ہری بھری فصلیں اناج سے خالی، باغات کو پھل کیا لگنا تھا پھول تک نہ لگے، دریا میں پانی تو تھا مگر مچھلیاں نہ رہیں نہ اور عورتیں گبھن تو ہوتیں مگر حمل گر جاتا۔ وڈکوں نے بتایا کہ یہ سب ان کے گناہوں کے سبب ہے۔ لہذا صدقہ خیرات اور توبہ معافی کا بہت دور چلا مگر حالات جوں کے توں رہے۔ حالت نقل مکانی تک آگئی لیکن جاتے تو جاتے

کہاں۔ جہاں جہاں تک ستلج بہہ رہا تھا یہی صورت حال تھی۔ کسی نے کہا کہ کڑوے کنوئیں کا پانی دریا میں انڈیلو تو اُنڈیل دیا۔ کسی نے کہا کہ سات کنواری لڑکیاں سات دن الف ننگی دریا میں نہائیں تو یہ ٹونہ بھی کر لیا مگر سب کچھ ویسے کا ویسے۔ اُلٹا کئی حرامیوں کی بُنڈ کُٹائی گھونگے میں ہو گئی کہ جو اِن باکرہ دوشیزاؤں کو نہاتے ہوئے تاڑنے کے واسطے اِدھر اُدھر جھاڑیوں میں چھپ جایا کرتے تھے۔ اُن کا ردِ عمل یہ تھا کہ لڑکیوں کا انتخاب غلط ہوا ہے اِن میں سے کئی تو باکرہ ہی نہیں بلکہ اَنواسی تھیں۔ معاملہ بہت نازک تھا۔ تنازعے کی نوعیت میں مکاشفات دخیل ہوئے تو اس ٹونے کو ہی موقوف کرنا پڑا"(۲۹)

مندرجہ بالا اقتباس سے مذہبی زبوں حالی اور ثقافتی عناصر کا ملاپ بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ نہری علاقوں میں زندگی کا دارومدار زراعت سے ہوتا ہے اگر دریا کا پانی خشک ہو جائے یا بارش کم ہونے کی وجہ سے دریا کی روانی میں فرق آ جائے تو ایسے میں زندگی مفلوج ہو جاتی ہے۔ اس خوف سے غلط عقائد راسخ ہو جاتے ہیں، جو نسل در نسل چلتے رہتے ہیں۔ ان عقائد کو ثقافت کا اہم حصہ خیال کیا جاتا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ اس کے فوائد یا نقصانات کیا ہوں گے۔ محض اپنی خوش اعتقادی ان کے اپنے استحصال کا ذریعہ بھی بن جاتی ہے۔

"اس ناول میں میں غربت کی لکیر سے نیچے اور افلاس کی متنوع صورتوں سے دوچار ہوتے کرداروں میں جیسی جذباتی قوت، جبلت کا زور اور وجود کا احساس ملتا وہ کہانی میں جاذبیت پیدا کرتا ہے، اور ہم محسوس کرتے ہیں"(۳۰)

بہاول پور کی ثقافت کی بات کی جائے تو تقسیمِ بر صغیر سے قبل بہاول پور ایک آزاد اور خود مختار ریاست کے طور پر موجود رہتی ہے۔ اس علاقے کا اپنا قدیم ثقافتی ورثہ ہے۔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب میں محض کسی ایک مذہب یا قوم کے لوگوں کے عقائد و نظریات اور ان کے ثقافتی عوامل نہیں بلکہ بعض اوقات ان سب کے اشتراک سے ایک مشترکہ تہذیب جنم لیتی ہے۔ جن میں ان کے عقائد و نظریات کی آبیاری بھی ملتی ہے۔ ناول میں اس حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو

"رُت بدلی تو زندہ پیر کا نام بھی "پیر زندہ کرامت" ہو گیا اور پھر ہر سال ان کا عرس اس دن کی مناسبت سے منایا جانے لگا کہ جس روز انہوں نے پتن سے اپنا پڑاؤ کسی نامعلوم مسافت کی جانب سے اٹھایا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ کب کا واقعہ تھا مگر نسل در نسل ہر کوئی اسے اپنے باپ دادا سے نسبتاً چلا رہا تھا۔ جس طرح پیر زندہ کرامت کی

اصل پہچان کے بارے میں کوئی بھی یقین سے کچھ نہیں جانتا تھا۔ مسلمان ان کو انہیں اللہ کا وَلی، ہندو رام کا اوتار، اور بدھ مت والے بدھ پیشوا جان کر ان کے میلے میں شریک ہوتے "(۳۱)

ثقافت کے عناصر مذہب و قوم سے بالاتر ہوتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ ایک باہمی ہمدردی، بھائی چارے کا بیان اور مخلصی بھی اس ثقافت کا ایک اور اثاثہ ہے۔ لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت ہمدردی کے جذبات بھی ہیں۔ انگریزوں سے قبل تمام مذاہب میں ہم آہنگی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ انہوں نے اپنی حکمرانی کو دوام بخشنے کے لئے تمام حدوں کو پار کر دیا۔ لوگوں میں نفاق کا وہ بیج بویا کہ وہ نہ صرف بین المذاہب بلکہ ایک مذہب میں کئی فرقے اور طبقے پیدا کر دیئے۔ ان کی نااتفاقی سے اس نے اپنی حکومت کو ایسا دوام بخشا کہ اس کے مسائل بھی ان لوگوں نے حل کرنا شروع کر دیے۔ دوسری طرف ان لوگوں کے دلوں میں موجود ثقافت کی محبت کو بھی ان غاصب قوتوں نے کم کرنے کی کوشش کی کچھ اس کو جنون کی کیفیت میں بدل کر اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ ان کے عقائد و نظریات کو ان کے خلاف استعمال کیا گیا۔ مثلاً ریلوے لائن کے راستے میں آنے والے قبرستان کو اجاڑنے اور پھر اس کے بعد فسادات جس میں نقصان بالآخر ان غریب لوگوں کا ہی ہوا۔ ان کی قوت میں مزید کمی ہو گئی اور سامراجی قوت نے اس کا فائدہ اٹھایا۔

"اتنے میں کسی اور نے آواز لگائی کے یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو چالیس درویشوں کو ساتھ لو اور شہداء کی قبریں ڈھونڈنے کے لیے پورا استلج کھود ڈالو۔۔۔ کہیں تو ان کے مزارات ہوں گے۔ ایک آواز اُبھری کہ آج زندہ واپسی کا ارادہ حرام ہے۔۔۔ آج کا دن صرف شہادت، صرف شہادت، اس کی بات ختم ہوتے ہی پورا مجمع چلانے لگا صرف شہادت۔۔۔ صرف شہادت "(۳۲)

اس ثقافت میں اپنے بزرگوں کا احترام اور اہمیت کی فراوانی ہے۔ ناول کے اس اقتباس سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لوگ کس قدر اپنے مذہب اور روایت سے جڑے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے عقائد ان کی رسومات ان کی روایات ان کے لیے سب سے زیادہ مقدم اور محترم ہوتی ہیں۔ وہ ان کے لئے اپنی جان تک کی فراوانی دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اس جذبے کو بعض اوقات سامراجی طاقتیں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتی ہیں، اور یہ جذبات ان کے ذاتی نقصان میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

ناول میں مولوی جاراللہ، مولوی بخشو اور سنگری کے تناظر میں بہاول پور کی ثقافت کی عکاسی بھرپور انداز میں کی گئی ہے۔ناول نگار نے ان کرداروں کے ذریعے ثقافت کو اُجاگر کیا ہے۔ جس میں مختلف طرح کی سماجی رسومات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ مثلاً مولوی جاراللہ کی وفات کے بعد اس کے ورثاء میں جائیداد کی تقسیم کا تنازع پیدا ہوا۔اس تنازع میں وراثت کا حق حاصل کرنے والوں اور اصل حقداروں یا دعویداروں میں فرق روا رکھنا کافی حد تک مشکل ہوتا ہے۔ ایسے معاملات میں زیادہ فوقیت مذہب کی بجائے مقامی ثقافت کے تحت پروان چڑھنے والے رسوم و رواج کو حاصل ہوتی ہے۔یہ لوگ اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔وراثت کی تقسیم کا طریقہ کار بھی مذہب سے زیادہ رسوم و رواج کے تحت پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔اس حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> "مولوی جار اللہ کے قتل نے بھی اس کی چار بیویوں اور ان کی اولاد کے درمیان ان دیکھے تناؤ کی چادر تان رکھی تھی۔ وراثت کی تقسیم نے جہاں بیواؤں اور بیٹیوں کو محروم رکھا وہاں بیواؤں کے ہاں بیٹوں کی تعداد نے بھی فتنے کا بیج بو دیا"(۳۳)

اس طرح کے مسائل عموماً دیکھنے میں آئے ہیں ان کا حل ہدایات کے تناظر میں کیا جاتا ہے۔ بخشو نے بھی طاقت کے زور پر اس مسئلہ کو اپنے انداز میں حل کر لیا۔ مذہبی رہنماؤں کا بھی ایک خاص تقدس ہوتا ہے۔ان کا احترام ثقافت میں شامل ہے خواہ کسی بھی مذہب کے پیشوا ہوں ان کو عوام کی طرف سے عزت ملتی ہے۔ بعض اوقات وہ اس عزت و احترام کو اپنا وراثتی حق سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر ان کی عزت و احترام عام لوگوں سے زیادہ کیا جاتا ہے۔ مولوی چاہے خود جیسے بھی کردار کا ہو ان کی وضع داری کا اہتمام عوام کی طرف سے بطورِ خاص کیا جاتا ہے۔ سنگری بھی جب بیاہ کے مولوی خاندان میں آئی تو اس کو بھی وہی عزت و احترام دیا گیا جو دوسری عورتوں کو جن کا تعلق مولوی خاندان سے تھا۔ مولوی اللہ رکھا جب سنگری کے گھر جاتا ہے تو اس کے دروازے پہ کھڑا منگر سنگری کا خالہ زاد ہونے کے باوجود اسے برا لگتا ہے۔ وہ اس کے وجود کو ایک مولوی کے حجرے کے باہر برداشت کرنے سے قاصر رہتا ہے۔

> "مُلا خاندان سے رشتے کی جڑت کے بعد جب لڑکیوں کے نزدیک رشتے بھی اجنبی قرار دیے جائیں تو ایسے میں یہ دور پار کا سانڈ کیسے زنان خانے کی در سال سے جڑ کر کھڑا رہ سکتا تھا۔ منگر نے چوکھٹ چھوڑنے میں قدرے تاخیر کی تو مولوی رکھے نے دو چار ہاتھ جڑ دیئے کہ بھین تڑیک ادھر کھڑا کیا کر رہا ہے"(۳۴)

بستی آدم واہن کے باسی اپنی ثقافت اور روایات کے پاسدار تھے، لیکن ان کی سماجی حیثیت ان کے ارادوں کی تکمیل میں حائل تھی وہ چاہتے ہوئے بھی انگریز کے خلاف کوئی عملی قدم نہیں اٹھاسکتے تھے۔ لیکن ان کی رگوں میں اترنے والے خون میں اپنی مٹی سے محبت کا درس موجود تھا۔ وہ انگریزوں کی مہربانی کی حقیقت کو سمجھ پارہے تھے کہ اصل میں ان کے ذاتی مقاصد ہیں جن کی تکمیل کے لئے وہ ان کا استحصال اور بعض اوقات بظاہر ہمدردی کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے تشخص کو ہر صورت برقرار رکھنا چاہتے تھے جس کو کمپنی کے افسر مٹانے پہ تُلے ہوئے تھے۔

"بستی کے لوگوں میں نہ صرف یہاں کے افسروں بلکہ ہر اس شخص کے ساتھ شدید نفرت تھی جو ان کے بارے میں کوئی نرم بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ دریائے ستلج پر لوہے کا پُل بنا کر اس کے اوپر سے لوہے کا شیطانی جِن گزارنا یہاں کی دھرتی اور ستلج ندی کو انواسی کرنا تھا جس کا نتیجہ سوائے بربادی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا"(۳۵)

ناول میں ناول نگار نے نہ صرف مذہبی حوالے سے ثقافتی پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے بلکہ عورت کی سماجی حوالے سے حیثیت کو بھی بیان کیا ہے۔ ناول نگار نے کردار نگاری کے فن کو بڑے عمدہ طریقے سے برتا ہے۔ ناول میں سنگری کا کردار آغاز سے اختتام تک موجود رہتا ہے، جو سماجی مسائل کا شکار نظر آتی ہے۔ معاشرے میں عورت کی حیثیت اور ایسی عورت جو خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ کمزور طبقے یا لاوارث ہو تو اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔

"انہوں نے انگریز کی عمل داری کا عہد اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے اور علاقہ بھی وہی رکھا جس کی تاریخ، تہذیب و سماج اور ثقافت سے وہ براہِ راست آگاہ ہیں۔ سرائیکی بیلٹ کی یہ دنیا اپنے منفرد تاریخی و ثقافتی نقوش تو رکھتی ہے لیکن اس کے علاوہ نو آبادیاتی زندگی میں اس علاقے کے مکین جس صورتِ حال سے دوچار ہوئے اور جس طرح انہوں نے ایک مقاومت کا اظہار بھی کیا، وہ حفیظ خان کی توجہ کا خاص مرکز ہے"(۳۶)

ناول نگار نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ناول نگار نے اس کردار میں ہمت دکھائی ہے جو معاشرے کے ستم کے باوجود اپنا استحصال کروانے کے بجائے مشکلات سے اپنا راستہ نکالنا چاہتی ہے۔ اس نے تمام حدوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس نے جینے کا ایک الگ ڈھنگ نکال رکھا تھا۔

"اپنی نگاہوں میں وہ انواسی ہو کر بھی لاکھوں کنواریوں سے برتر تھی۔ اس کے دل میں اُسے کسی کی بھی پرواہ نہیں رہی تھی حتیٰ کہ اپنی ماں کی بھی نہیں۔ جب سماج اور سماجی بندشیں اس نے اپنے پاؤں کی ٹھوکر تلے رکھ چھوڑی ہوں تو کسی کی بھی پروا کرنا بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ انواسی تو خواہشاً نہیں بل کہ جبراً غرض ہوئی تھی لہٰذا اسے اس کی اخیر تک پہنچنے کے لیے مکر و فریب، حیلہ سب کچھ روا تھا۔ اب نہ تو اُسے اپنی روح کی فکر رہی تھی اور نہ ہی مذہب اور سماج کی"(۳۷)

سنگری کا کردار ایک مضبوط کردار ہے جو تمام مشکلات کے باوجود زندہ رہنے کا ڈھنگ جانتی ہے۔ وہ اپنے لیے نیا راستہ بنانا جانتی ہے، وہ جانتی ہے کہ اس نے اپنے مسائل کا حل کس طرح تلاش کرنا ہے وہ مرد کے بارے میں بھی الٹے خیالات واضح کرتی ہے کہ مرد وہ ہے جو اس کی عزت کرے نہ صرف اس کے حُسن سے ملحوظ ہو بلکہ اس کے داخلی معاملات کو بھی سمجھے۔ ناول میں موجود یہ کردار ثقافتی عوامل کے ساتھ ساتھ سماجی مسائل کا بھی بیان کرتا ہے۔ اس کے متعلق ارشد محمود لکھتے ہیں کہ:

"سب سے زیادہ شامت لڑکی ذات کی آتی ہے۔ اس کے معاملے میں یہ معاشرہ نہایت مجرمانہ خیالات کا حامل ہے۔ پاکیزگی، صلاحیت اور شرافت کے نام پر یہ لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتا ہے۔ اس فرسودہ تہذیب میں لڑکیوں کو جیسے کچلتے ہیں وہ جدید ذہن کے لیے بڑا ہی اذیت ناک ہے۔ اس معاشرے کے نزدیک اخلاق بڑا ہے انسان چھوٹا ہے۔"(۳۸)

اس معاشرے کے نزدیک لڑکی کے خود کے جذبات کی کوئی اہمیت نہیں، یہاں عورت کو اپنی جنس پر کوئی اختیار نہیں۔ غریب اور قبائلی علاقے میں لڑکی کے جنسی رویے پر ذرا سا شک اس کے قتل کا سبب بن سکتا ہے۔

ناول کے اختتام پر سیلاب کی وجہ سے پوری بستی کا برباد ہو جانا ایک علمیے کی صورت میں اُجاگر ہوتا ہے۔ تمام لوگ زندگی کی بقا کی جنگ لڑتے ہیں۔ بہت سے لوگ موت کے منہ میں چلے گئے جن کی لاشوں کو دفنانے والا بھی نہ تو کوئی موجود ہے اور نہ ہی ان پہ گریہ زاری کرنے والا بل کہ تمام لوگ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ناول نگار نے سیلاب کے بیان سے دریا کے کنارے بسنے والے لوگوں اور خصوصاً بہاول پور کی ثقافت کی نمائندگی بھی کی ہے اور ان مسائل کا ہر سال شکار ہونے والوں کا بیان اور زندگی کا فلسفہ بھی ناول نگار نے بیان کیا ہے۔ موت ایسی حقیقت ہے جس سے کسی کو مجال انکار نہیں لیکن اپنی زندگی کی بقا کے لیے کسی

دوسرے کی پرواہ نہیں کرتا۔ ایسے میں ذات پات کا فرق بھی مِٹ جاتا ہے، موت تمام بندشوں کو توڑ ڈالتی ہے۔

"ٹیلوں پر قبضہ جمانے کی غرض سے کی جانے والی دوڑا دوڑی اور بھاگم بھاگ میں اگر کوئی کہیل، کٹانا، کمہار یا چمار مولویوں کی حویلی کے پاس سے گزرتا اور باہر موجود مُلا خاندان کے کسی فرد کے روکنے پر بھی نہ رُکتا تو وہ سب حیرت سے ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھتے کہ جیسے کہ قیامت کا دن رات میں اُتر آیا ہو"(۳۹)

ناول کا یہ اقتباس اس معاشرتی حد بندی کی قعلی کھولتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ انسانی قدریں سب سے مقدم ہوتی ہیں جس معاشرے میں ان قدروں کی پاسداری نہیں ملتی وہ معاشرہ زیادہ دیر اپنا توازن پورا نہیں رکھ سکتا۔ سیلاب کی وجہ سے گاؤں کی تباہی کا بیان اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ناول میں ناول نگار نے بہاول پور کی مجموعی ثقافت کے ساتھ ساتھ مذہبی، سماجی اور معاشرتی مسائل کو بھی عمدگی سے بیان کیا ہے۔ ناول نگار نے بہاول پور کی ثقافت کا انگریزی ثقافت کے ساتھ بیان سے تقابل بھی پیش کر دیا ہے، جس سے اس دھرتی کی ثقافت کی جان اور اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔

حوالہ جات

1۔ زاھد علی، سید، ڈاکٹر، بہاول پور کی سر زمین، بیکن بکس، ملتان، ۱۹۹۹ء

2۔ فیض احمد فیض، ہماری قومی ثقافت، ادارہ یادگارِ غالب، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص ۶۶

3۔ حسنین کاظمی، اوراقِ فیض، مشمولہ: ہماری قومی ثقافت، ادارہ یادگارِ غالب، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص ۱۸

4۔ فیض احمد فیض، ہماری قومی ثقافت، ص ۹۰

5۔ محمد نعیم ورک، اردو ناول کا ثقافتی مطالعہ، کتاب محل، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۴

6۔ منیر فیاض، عالمی افسانوی بیانیے کا اجمالی ارتقااور انواسی، (مضمون) مطبوعہ: ادبیات، خصوصی شمارہ: اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ، شمارہ ۲۰۲۰ء، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ص ۵۵۔۳۵۴

7۔ محمد حفیظ خان، انواسی، ص ۵

8۔ ایضاً، ص ۳۵

9۔ مبارک علی، ڈاکٹر، جاگیر داری اور جاگیر دارانہ کلچر، مشعل بکس، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۲۴

10۔ ایضاً، ص ۹۹

11۔ محمد حفیظ خان، انواسی، ص ۱۰۱

12۔ ایضاً، ص ۸۸

13۔ ایضاً، ص ۱۰۱

14۔ ایضاً، ص ۱۱۳

15۔ ایضاً، ص ۱۲۹

16۔ ایضاً، ص ۳۰۔۱۲۹

17۔ ایضاً، ص ۳۱۔۱۳۰

18۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، کلچر کا مسئلہ، علمی پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۸۴

19۔ محمد حفیظ خان، انواسی، ص ۱۷۰

20۔ ایضاً، ص ۱۷۱

21۔ ایضاً، ص ۱۷۶

22۔ ایضاً، ص۲۲۵

23۔ ایضاً، ص۲۲۷

24۔ ایضاً، ص۲۲۸

25۔ ایضاً، ص۲۴۱۔۲۴۰

26۔ ایضاً، ص۲۴۴

27۔ ایضاً، ص۲۴۴

28۔ ایضاً، ص۲۵۴

29۔ ایضاً، ص۴۲

30۔ مبین مرزا، اکیسویں صدی کے دو عشروں میں اردو ناول پر اجمالی نظر، مشمولہ: ادبیات، اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ ۲۰۲۰ء، ص۷۵

31۔ محمد حفیظ خان، انواسی، ص۴۴۔۴۳

32۔ ایضاً، ص۲۰۰

33۔ ایضاً، ص۲۴۴

34۔ ایضاً، ص۲۵۳

35۔ ایضاً، ص۳۰۴

36۔ مبین مرزا، اکیسویں صدی کے دو عشروں میں اردو ناول پر اجمالی نظر، مشمولہ: ادبیات، اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ، ص۴۷

37۔ محمد حفیظ خان، انواسی، ص۹۔۳۰۸

38۔ ارشد محمود، ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ، سٹی پریس، کراچی، ۲۰۱۲ء، ص۴۰

39۔ محمد حفیظ خان، انواسی، ص۳۱۴

باب چہارم

ناول "انواسی" کا سیاسی تناظر میں مطالعہ

سیاست کیا ہے؟

اصطلاحی اعتبار سے لفظ سیاست حکومت و سلطنت انتظام ملک کی حفاظت اور نگرانی کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ سیاست سے مراد ریاست اور حکومت کے مابین تعلق ہے۔ سیاست انگریزی لفظ (Politics) یونانی زبان کے لفظ (Polis) سے نکلا ہے جس کے معنی شہر یا شہری ریاست کے ہیں۔

> "سیاست عربی زبان کا لفظ اور اسم مونث ہے۔ فرہنگ تلفظ میں سیاست کے معنی حکمرانی، حکمت عملی، ملکی امور، مصلحت اندیشی، حصول اقتدار اور تحفظ مفادات کے لیے جدوجہد ہے۔"(۱)

ادب انسانی زندگی کا ترجمان ہوتا ہے انسانی زندگی میں موجود تمام عوامل جن کا تعلق خوشی سے ہو یا غم سے، سماج سے ہو یا سیاست سے تمام تر ادب میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ادیب معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے وہ اپنے ارد گرد جو کچھ ہوتے دیکھتا ہے اسے الفاظ کے قالب میں ڈھال دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ادیب جنہیں سیاست سے لگاہوتا ہے ان کے ہاں ادب میں سیاست کے اثرات جابجا نظر آتے ہیں۔ ادب اور سیاست کے تعلق پر مبنی موضوعات کو ناقدین ادب کی توجہ بھی حاصل رہی ہے۔ اس کی وجہ سیاسی اتار چڑھاؤ کا سماجی حالات وواقعات پر اثر انداز ہونا ہے۔ ادب اور سیاست کے تعلق پر بات کرتے ہوئے راجندر سنگھ بیدی لکھتے ہیں "ادب سیاست سے الگ نہیں رہ سکتا یہ ایک پامال مضمون ہے اور یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے سیاست سے۔"(۲)

ہر ملک اپنے مختلف سیاسی و سماجی حالات رکھتا ہے اور اس کے مخصوص سیاسی و سماجی حالات وہاں کے ادب میں جھلکتے نظر آتے ہیں۔ ہر زندہ ادب اپنے عہد کے سماجی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی ماحول کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ سیاست ہر جگہ ہے ہر طرف ہے اور فن اور ادب کی تخلیق میں ہے۔ قومی انگریزی لغت میں سیاست کی تعریف کو اس طرح سے بیان کیا گیا ہے:

"سیاست سے مراد حکومت کاری کا علم، کسی حکومت قوم یا کسی مملکت کی حکمت عملیاں اور مقاصد، سیاسی جماعتوں کے طور طریقے اور ان کے مقابلے، سیاسی معاملات کسی شخص کے سیاسی روابط یا عقائد ان لوگوں کی ریشہ دوانیاں یا منصوبہ بندیاں جو ذاتی طاقت، شان و شوکت، منصب یا اسی قسم کے دیگر مقاصد کے لیے ہوں۔"(۳)

ادب زندگی کا ترجمان ہے اور اگر سیاست زندگی کا حصہ ہے تو ادب کو اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی چیز سیاست سے الگ نہیں یہ زندگی کے ہر پہلو میں شامل ہو کر اسے متاثر کرتی ہے اور چونکہ ادب زندگی کا ترجمان ہے لہذا یہ لا محالہ ادب کا حصہ بن جاتی ہے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ادب کا اپنے ملک کی قومی اور انقلابی سیاست سے متاثر ہونا فطری بات ہے لیکن ادب کو کسی سیاسی جماعت کا آلہ کار نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس ملک کے لوگوں میں سیاسی شعور بیدار کرنے کا ذریعہ بننا چاہیے۔ وہ لوگوں کے اندر اچھائی اور برائی میں تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا کرے تاکہ انتشار پسند قوتیں انقلاب کے نام پر لوگوں کی جان و مال سے کھیلنے کی جسارت نہ کر سکیں یوں ادب تعمیرِ وطن میں ایک اہم کردار ادا کر سکتا ہے اور ادب اور سیاست کا تعلق مضبوط اور پاکیزہ تر ہو سکتا ہے۔

بہاول پور کی سیاسی تاریخ، جدوجہد، سعی عمل، جرأت و بے باکی، ایثار و قربانی کی تاریخ ہے۔ بہاول پور کی عوام غلامی کی دوہری زنجیروں میں جکڑے رہے ہیں، ایک طرف انگریزی سماج تھا تو دوسری طرف ریاست کے امرا کی مطلق العنانیت، ان حالات میں ریاستی باشندوں نے اپنی سیاسی جدوجہد کا آغاز کس طرح کیا؟ اس راہ میں کیسی کیسی مشکلات پیش آئیں؟ آمریت سے نکل کر جمہوریت کی راہ پر کیسے گامزن ہوئے، پھر دور جمہوریت میں کیا کیا تجربے ہوئے کیسے کیسے ظلم ہوئے۔ ریاست بہاول پور ریاست سے صوبہ، صوبہ سے ڈویژن میں کس طرح تبدیل ہوئی، یہ ایک طویل، دردناک، اور سبق آموز داستان ہے۔

"جغرافیائی طور پر ریاست بہاول پور (موجودہ بہاول پور ڈویژن) ۲۷.۴۲ درجے سے ۳۰.۲۵ درجے شمالی عرض بلد کے درمیان اور ۶۹.۳۱ درجے سے ۷۴۱ درجے مشرقی طول بلد کے درمیان واقع ہے۔ اس طرح سمندر سے اس کی بلندی ڈیڑھ سو میٹر ہے یہ

شرقاً غرباً چار سو اسی کلومیٹر طویل اور شمالاً جنوباً اسی کلومیٹر سے لے
کر ایک سو پچھر کلومیٹر وسیع ہے۔"(۴)

نقشے کے مطابق اس کی شکل ایک مشکیزے سے مماثلت رکھتی ہے۔اس کا کل رقبہ پنتالیس ہزار پانچ سو اٹھاسی(۴۵۵۸۸)مربع کلومیٹر پر محیط ہے،ریاست بہاول پور کا رقبہ دنیا کے کئی مملک مثلاً اسرئیل، کویت، لبنان، اور ڈنمارک کے برابر تھا جبکہ موجودہ دور رقبے کے اعتبار سے بہاول پور کو پنجاب کی سب سے بڑے انتظامی ڈویژن کا درجہ حاصل ہے۔

جہاں تک اس کے حدود اربعہ کا تعلق ہے تو اس کے شمال اور مغرب میں دریائے ستلج واقع ہے۔جو اسے اضلاع ساہیوال اور ملتان سے جدا کرتا ہے۔پھر ستلج اور چناب کا مشترکہ طاس اسے ضلع مظفر گڑھ سے الگ کرتا ہے اور پھر آخر میں کوٹ مٹھن جہاں تمام دریا، دریائے سندھ کا سنگم بناتے ہیں وہاں ڈیرہ غازی خاں اور گھوٹکی کے اضلاع اس سے علیحدہ ہوتے ہیں۔اس کے شمال مشرق میں ہندوستان کے ضلع فیروزپور اور جنوب میں بیکانیر، جیسلمیر کی ریاستیں اور صوبہ سندھ واقع ہے۔ان جغرافیائی خصوصیات کی بنا پر خطہ بہاول پور کو Buffer State کا درجہ حاصل تھا۔

ریاست بہاول پور کی تاریخ

ریاست بہاول پور کی تاریخ ڈھائی سو سال سے زیادہ پرانی ہے۔بہاول پور کے داؤد پوترہ حکمران اور سندھ کے کلہوڑا حکمران اپنے آپ کو حضور اکرمؐ کے چچا حضرت عباسؓ کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ۱۲۵۸ء میں ہلاکو خان کے ہاتھوں بغداد کی تباہی کے بعد عباسی خاندان اپنی ناموس بچانے کے لیے قاہرہ(مصر)میں پناہ لے لی۔

"اسی خاندان کے ایک فرد سلطان احمد ثانی نے ناسازگار حالات کی بنا
پر ۱۳۶۶ء سے ۱۳۷۰ء کے درمیان اپنے خاندان اور متوسلین کی ایک بڑی
تعداد کے ہمراہ سندھ کی طرف ہجرت کی"۔(۵)

کوٹ کانجی کے حکمران رائے دھورنگ نے سلطان احمد ثانی کو خوش آمدید کہا۔اور اپنی بیٹی کی شادی بھی اس سے کر دی۔رائے دھورنگ کی بیٹی سے سلطان احمد ثانی کے ہاں تین لڑکے پیدا ہوئے۔ان میں سب

سے بڑا ابو النصر تھا۔ جو اپنے نانا کی وفات کے بعد کوٹ کانجی کا حکمران بنا، اس کی اولاد میں ایک بہادر شخص امیر چنی گزرا ہے۔

امیر چنی خان کا دور

امیر چنی خان بڑا حاضر دماغ دانش مند اور ذہین شخص تھا۔ اس نے اکبر اعظم کی ملازمت اختیار کر کے مغل شہنشاہ سے امیر کا خطاب پایا۔

> ''مزید اسے مغلیہ سلطنت نے پنج ہزاری کا منصب اور حامی دین کا خطاب بھی دیا۔''(۶)

اس کے علاوہ سندھ کے علاقہ اباڑور سے لاہوری بندر گاہ تک کا علاقہ بھی اسے دے دیا۔ سیون کو مرکز بناتے ہوئے اس نے فعل تاجدار کے لیے وصولی کی ذمہ داری عمدہ طریقے سے نبھائی۔ امیر چنی خان کے دو بیٹے داؤد خان اور مہدی خان تھے۔ امیر چنی نے وفات سے پہلے اپنے بیٹے امیر زادہ محمد مہدی خان کو اپنا جان نشین مقرر کیا۔ داؤد پوتروں اور کلہوڑوں میں بعض معاملات کی بنا پر رقابت شروع ہو گئی جس کی وجہ سے ان کے درمیان کئی معرکے ہوئے۔ آخر اگست ۱۷۲۶ کو امیر محمد مبارک خان کی وفات کے بعد امیر صادق محمد خان اوّل داؤد پوتروں کا سردار مقرر ہوا۔ امیر صادق خان اوّل وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اس خاندانی کشمکش سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ۲۷۔۱۷۲۶ میں سندھ کو خیر باد کہہ کر مخدوم شیخ عبد القادر کی دعوت پر اوچ آ گئے۔

صادق محمد خان اوّل کا دور

صادق محمد خان کا دور بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ جاگیر کے حصول کے بعد امیر صادق محمد خان کے مقبوضات میں توسیع کا سلسلہ شروع ہوا۔ انہوں نے سب سے پہلے ان قبیلوں کو زیر کیا جنہوں نے اپنی خود مختاریاں قائم کر رکھی تھیں۔ اس کے بعد امیر صادق محمد خان نے جیسلمیر کے راجہ راول اگہی سنگھ کو زیر کیا۔ اس طرح صادق محمد خان اوّل وہ عالی ہمت شخص تھا جو جزوی طور پر ریاست بہاول پور میں ایک قبائلی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔

''اس نے ۱۷۲۹ء میں اپنی ریاست کو باقاعدہ انتظامی خطوط پر استوار کرنے
کے لیے اس کے پہلے دار لحکومت ''اللہ آباد'' کی بنیاد رکھی۔''(۷)

۱۷۳۳ء میں صادق محمد خان اوّل نے قلعہ ڈیر اور پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔اس طرح اس علاقے میں صادق محمد خان کی بہادری کی ڈھاک بیٹھ گئی۔اس کے بعد لکھویروں کو زیر کیا اور ان کے علاقہ ٹھٹ پر قبضہ کر لیا اس کارگزاری کے صلے میں اس علاقے کی تمام جاگیر انہیں مل گئی۔

محمد بہاول خان اول کا دور

امیر صادق محمد خان اوّل کے بعد ان کے ولی عہد امیر محمد بہاول خان اوّل تخت نشین ہوئے ان کی مدت حکمرانی اگرچہ صرف تین سال رہی لیکن اس کے دور حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ بہاول پور شہر کی تعمیر ہے۔ریاست بہاول پور کا اصل بانی بھی نواب بہاول خان اوّل کو ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔امیر محمد بہاول خان اوّل کو ایک ایسے مقام کی اشد ضرورت تھی جسے وہ اپنا باقاعدہ دار لحکومت قرار دیں جہاں سے وہ اپنے مقبوضات کا انتظام و انصرام خوش اسلوبی کے ساتھ کر سکیں؟اس مقصد کے لیے جھوک سوڈھا نامی بستی کا انتخاب کیا گیا۔اس کے اردگرد ایک فصیل بنوائی، نیز یہاں اپنی رہائش کے لیے محل تعمیر کرادیا اور دیگر شاہی عمارات کی بنیاد بھی رکھی۔امیر محمد بہاول خان کے دور میں ریاست بہاول پور کی حدود میں مزید اضافہ ہوا۔اس نے ریاست میں موجود کئی سازشوں پر بھی قابو پایا اور کئی دیگر مخالف طاقتوں پر تسلط حاصل کر کے اپنے جانشین کے لیے ایک مستحکم حکومت چھوڑی۔

(الف) ناول "انواسی" میں پیش کی جانے والی سیاسی صورت حال

ناول "انواسی" میں وہ تمام باتیں پیش کی گئی ہیں جو انگریزوں کی آمد کے ساتھ ہی ریاست بہاول پور کے بارے میں ہمارے ذہن میں آتی ہیں۔کیوں کہ بہاول پور میں انگریزوں کی آمد کے ساتھ ہی یہاں کی سیاسی صورت حال اور نئی انتظامیہ کے حوالے سے بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں ہیں۔اگر دیکھا جائے تو ریاست بہاول پور کے نوابین کا نظام ہی بدل چکا تھا جس کی وجہ سے ریاست بہاول پور کا بنیادی نظامِ حکومت مکمل طور پر ختم ہو چکا تھا۔اب اس نئے نظام کو لوگوں نے اپنانے کی بجائے اس سے عناد کو فروغ دینا شروع کر دیا تھا۔اس کے بارے میں ڈاکٹر زاہد لکھتے ہیں کہ:

۱۷۸۱ء میں نواب بہاول پور خان نے جب دریا پار کے علاقوں کا جائزہ لیا تو ان علاقوں پر ملتان کے حکمرانوں اور سکھوں کے حملوں کے پیش نظر وہاں انگریز فوج بھیج دی ،تاکہ وہاں ان کی حکمرانی رہے۔اس طرح دونوں ریاستوں کے تعلقات کشیدہ ہوگئے۔اس لئے انگریزوں نے اس قسم کے حالات سے فائدہ اٹھایا۔اور ان کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا"(۸)

ریاست بہاول پور کی سیاسی صورت حال کا جائزہ ہم حفیظ اللہ کے ناول "انواسی" میں ہمیں وہ تاریخی مناظر ملتے ہیں جو بہاول پور کی تاریخی کتابوں میں بھی موجود نہیں ہیں۔ دیکھا جائے تو حفیظ اللہ "انواسی" کو ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے دور کا ایک منظر نامہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔اب اس ناول میں حفیظ اللہ نے جو سیاسی صورت حال بہاول پور اور اس کے مفافات کے حوالے سے پیش کی ہے اس کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیتے ہیں۔ ان تمام امور کو بھی ملحوظ رکھا جائے گا جو "انواسی" میں سیاسی صورت حال کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ ان تمام مناظر اور صورت حال کو مختلف اقتباسات کے ذریعے بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی جو اس ناول میں سیاسی صورت حال کو اس علاقے کی اقوام کو متحرک کرنے کا ذریعہ بنی ہے حفیظ اللہ لکھتے ہیں کہ:

"چند منٹ کے بعد ہی دریا کے کنارے بنے میدان جنگ میں کوئی شخص بھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہ دیکھا گیا۔گھڑ سوار فورس تھی یا زمین پر گرے پڑے عام لوگ اور سبز حُبہ پوش درویش یوں ایک ایسی بغاوت کچل دی گئی کہ جہاں کچلے جانے والوں میں کوئی ایک بھی نہ تو بغاوت کا محرک تھا اور نہ ہی منصوبہ ساز"(۹)

ناول "انواسی" میں بہاول پور کی سیاسی صورت حال میں اس وقت اتار چڑھاؤ دیکھا جا سکتا ہے جب انگریزوں نے مقامی حکومت کے ساتھ مل کر یہاں کے لوگوں کا استحصال کرنا شروع کر دیا تھا۔ کیوں کہ وہ لوگ بہت زیادہ غیور اور مذہب پسند تھے اس لیے انگریزوں کی لاکھ کوششوں کے باوجود یہ لوگ ان سے قائل نہیں ہوئے۔ ان کی اَنا اور خودی ہی ان کی تباہی کا محرک بنی۔اس ناول میں جابجا دیکھا جا سکتا ہے کہ انگریز کس حد تک انسانیت کی تذلیل صرف اور صرف اپنی اجارہ داری کے لئے کرتے ہیں۔ ان تمام وجوہات کی وجہ سے یہاں کے لوگ جب مقامی نوابین کا حکم نامہ بھی مسترد کرتے دیکھے گئے تو نوابین نے انگریز حکومت کو فری ہینڈ دے دیا۔اس کے بارے میں ڈاکٹر اسلم آزاد لکھتے ہیں۔

"انگریزوں سے قبل کے برصغیر کے معاشرے اور آزادی کے بعد کے معاشرے میں فرق موجود ہے۔ جو مسائل انگریزوں سے پہلے تھے اب وہ نہیں ہیں۔ اور جو اس وقت تھے آئندہ نہیں رہیں گے۔ کیونکہ معاشرہ نگاری کے بغیر حقیقت نگاری کے شعار کا مظاہر محال ہے"(۱۰)

انگریز ایک طاقت ور قوم تھی اور وہ بستی آدم واہن کے رہنے والوں کو انسان بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی نظروں میں وہ بہت حقیر تھے یہاں تک کہ انگریز جب چاہیں ان کی عزتیں بھی پامال کرتے جن پر بستی والے ان کے خلاف احتجاج کرتے پر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ وہ اس قدر طاقت اور ہمت نہیں رکھتے تھے۔ اس کی ناول میں ایک واضح مثال ہمیں دیکھنے کو ملتی ہے۔

"اب اس کی گود میں ایک بن بیاہے گورے کی بیٹی تھی۔ جان برٹن حیران تھا کہ نفرت کرنے کا ہنر تو کوئی محکوم قوموں سے سیکھے۔ فاتحین کو تو نفرت کرنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا اور نہ ہی وہ جانتے ہیں کہ ظلم اتنا گہرا گھاؤ نہیں لگایا کرتا جس قدر گہرائی میں نفرت کی برچھی اُترتی ہے"(۱۱)

ان تمام باتوں کے باوجود یہاں کے لوگ ان کے ساتھ چلنے کو تیار نہیں تھے خاص کر نئی نسل تو پہلے ہی نوابین کی غلامی سے نجات چاہتے تھے لیکن ان کے آباءواجداد نے ان کے خلاف جانے سے انکار کر دیا۔ لیکن اب آباؤاجداد بھی اپنی غلطی کو تسلیم کر رہے تھے کہ یہ نوابین نے اچھا نہیں کیا کہ ان پر تیسری دنیا کے لوگ حکمرانی کے لیے مسلط کر دیے اس لیے نئی نسل کو اپنے اجداد کی پشت پناہی بھی حاصل تھی اس لیے انہوں نے کھل کر بغاوت کی لہر کو پروان چڑھایا تاکہ وہ اپنے اجداد کی عزت کو مجروح ہونے سے بچالیں اس طرح ہی ایک ایسے کردار کا ذکر حفیظ اللہ کرتے ہیں جو اپنے علاقے اور بستی کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا چاہتا ہے وہ منگر ہی ہے جو اب اس سیاسی صورت حال کا کھل کر سامنا کرتا ہے۔

"منگر ایک طرف کی شیوت کے بغیر اس کا نام بستی میں ہونے والی فسادات اور ریلوے برج پر حملے میں ملوث ہونے کے سلسلے میں لیا جارہا تھا اور دوسری جانب وہ عورت کے احسانات کا بدلہ چُکانا تو کیا اس سے شناسائی کے اقرار سے بھی انکاری ہوئی تھی کہ جس کی جان بچانے کے لیے اس نے اپنے آپ کو موت کے منہ میں دھکیل رکھا"(۱۲)

اَنا پرستی کے محرک کی وجہ سے انگریزوں نے بستی کے لوگوں پر ظلم و ستم کے انبار لگا دیے یہاں کے لوگ بنیادی ضروریات زندگی کے لیے بھی ترس رہے تھے لیکن انگریزوں کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ وہ کسی بھی صورت اس بستی کے قبرستان سے ریلوے لائن کو ضرور گزاریں گے۔ لیکن یہاں کے غیور لوگ اس بات سے بالکل ہی الٹ کام کرنے جارہے تھے۔ انگریز حکمرانوں نے ملتان کی مقامی حکومت سے مل کر ایک مکمل اور جامع منصوبہ بنایا جس کے تحت ان تمام لوگوں کو دنیا کے اس خطے سے مکمل طور پر ختم کر دیا جائے تا کہ اس ریاست میں نوابین کے خلاف کل کو کسی اور بستی کے لوگ نہ اُٹھ کھڑے ہوں۔

> "مَنگر حیران تھا کہ اس چھوٹی سی بستی میں ہونے والے ایک ہی دن کے فسادات سے ملتان کی مقامی انگریز حکومت ہل کر رہ گئی تھی اگر معاملہ صرف بستی میں ہونے والی ہلاکتوں کا ہوتا تو یہ انگریز سرکار کے اثاثوں سے چھیڑ خانی نہیں کہا جاسکتا تھا مگر یہاں تو انڈس ویلی اسٹیٹ ریلوے کی تنصیبات اور تعمیرات کو نشانے پر رکھا گیا تھا۔ بستی کے لوگ قسمیں اٹھاتے تھے کہ محض ریلوے برج کی بنیادوں کو بچانے کے نام پر ستر سے زیادہ ہلاکتیں ہوئیں ہیں"(۱۳)

اگر دیکھا جائے تو اس میں افسر شاہی سے زیادہ خود غرض کے عنصر شامل تھے۔ جیسے جان برٹن نے انگریز حکومت اور نوابین میں اپنی عزت افزائی کے لئے تمام معاملہ اپنے ہنر اور مہارت سے حل کرنے کا ایک جامع منصوبہ بنالیا تھا۔ اسلم آزاد لکھتے ہیں کہ:

> "ہمارے ناول نگاروں نے تاریخی ناول ایک خاص عہد کے سیاسی اور معاشرتی مطالبات اور اس عہد کے لوگوں کے ذہنی اور جذباتی تقاضوں کی بنا پر لکھے"(۱۴)

جس کا مقصد صرف اور صرف یہاں کے غیور لوگوں کا استحصال کر کے ان کو ختم کر کے نوابین اور انگریز حکمرانوں میں اپنی الگ سے پہچان بنا سکے۔ اس لیے اس تمام معاملہ کو طرح دینے میں جان برٹن کا کردار نمایاں اور مرکزی ہے۔ اس نے عوام کے دل سے نوابین کی عزت اور غلامی کا خوف مکمل طور پر ختم کر دیا تھا اب لوگ صرف اور صرف اس انگریز سالار سے ڈرتے تھے اور وہ سالار اپنی مقبولیت کے لئے نوابین کے تلوے چاٹ رہا تھا۔

"منگر تمام صورت حال کو اپنی غلطی سمجھ کر قبول کر چکا ہے لیکن جان کے ہونٹوں پر تشکر کی مسکراہٹ پھیل گئی مگر سائیں نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ جان نے اسے بخش دینے چاہی مگر وہ بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ سلام کرتا ہوا بگھی کو آگے بڑھا گیا۔ جان برٹن کو اس قدر کبیدگی کی توقع نہیں تھی"(۱۵)

جب انگریز حکومت مکمل طور پر بے بس ہو گئی تو یہاں کے لوگوں کا مکمل طور پر قلع قمع کرنے کے لیے انہوں نے ایک جامع منصوبہ بنایا کہ یہاں کے لوگوں کو ہم سیلابی موت عطا کرتے ہیں۔ ان کے گھر بار کو، فصلوں کو، جانوروں کو، اور مکانات وغیرہ کو پانی میں بہا دیتے ہیں۔ یہ لوگ مجبور ہو کر ہمارے پاؤں میں گر پڑیں گے اور ہم ان کے اوپر احسان کے ذریعے غلامی کی زنجیر ڈال دیں گے۔ اس تمام صورت حال کو جب انگریزوں نے مکمل طور پر بھانپ لیا تو وہ اس کے لئے خود کو تیار کرنے لگے۔ انہوں نے اپنی تمام تر توجہ بستی سے مکمل طور پر ہٹا کر ہیڈ سلیمانکی کے برج پر مرتکز کر دی۔ تاکہ اس کی جلد سے جلد تکمیل کی جائے اور برسات کے دنوں میں آنے والے پانی کو بستی کی طرف موڑ دیا جائے کیوں کہ یہ لوگ پانی کے آگے بے بس ہو جائیں گے اور خود بخود یہاں سے کسی اونچی جگہ اپنا نیا مسکن تلاش کریں گے، اور ہم سیلابی صورت حال کے بعد اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکیں گے۔ اس سلسلے میں حفیظ اللہ "انواسی" کے اختتام میں یہاں کی سیاسی صورت حال کے بارے میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"سیلاب کی اچانک آمد کے پیچھے انگریزوں کی سازش کار فرما ہے جو نہیں چاہتے کہ یہ بستی اور یہاں کے لوگ ان کے عزائم میں مزاحم ہوں۔ کچھ کا خیال تھا کہ اس مقصد کے لیے بستی کے لوگوں کو داروغہ کے ذریعے اگلے دن کا جھانسا دے کر پانی کی مقدار کو چھپایا گیا کہ جو اس شب بستی کو اپنی لپیٹ میں لینے والا تھا ضرور اس پل کی آڑ میں کوئی ایسا کام کیا جا رہا ہے کہ جس کے واسطے گوروں کو یہ بستی اس مقام پر نہیں چاہیے تھی۔ کئی لوگ اس آفت کو سات شہیدوں کی قبروں کی بے حرمتی سے جوڑ رہے تھے۔ لیکن بستی میں مختلف حیلوں بہانوں سے ناحق خون خرابہ ہوا تو یقین ہو گیا کہ یہ دریا اس بستی کو کھا جائے گا سو کھا گیا"(۱۶)

اس سارے قصے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انگریزوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے یہاں کے لوگوں کا بجا استحصال کیا ہے۔ جس کی وجہ سے یہاں انتشار اور بغاوت کی ایک نئی صورت حال نے جنم لیا تھا

لیکن انگریزوں نے آخری حد تک جانے کی ہر ممکن کوشش کی اور اپنی سیاسی بصیرت کی بدولت اور اپنے بدتر عزائم میں کامیاب ہوگئے۔ انہوں نے یہاں کے لوگوں کا بری طرح استحصال کیا۔ بقول ڈاکٹر صالحہ زریں:

> ۱۶۰۰ء سے ۱۹۴۷ء تک تو انتہائی غیر یقینی صورت حال رہی اور فساداتی ادب کا زور رہا لیکن اس کے بعد ناولوں میں سنجیدگی، متانت، فکری گہرائی اور انسانی آلام سے حصول سے نجات کی بیتابانہ لاشعوری خواہش ملتی ہے۔ کیونکہ یہ دور انگریزی تسلط اور اجارہ داری سے نکل کر شخصی ترقی کی طرف آرہا تھا۔"(۱۷)

ان کے لئے نوابین نے جو رستے ہموار کئے وہ نوابین کی اپنی رعایا سے بدسلوکی تھی کیوں کہ نوابین نہیں چاہتے تھے کہ یہاں کے لوگ ان کی غلامی کو خیر آباد کہیں اور اپنی من مانی زندگی گزاریں، ان تمام محرکات کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ سادہ لوح انسانیت کی تذلیل کی جائے تاکہ ان پر ان کی آنے والی نسلیں بھی حکومت کر سکیں۔ تاکہ ان کا کئی نسلوں سے بادشاہی نظام ختم نہ ہو جائے لیکن ان کے اجداد کو یہ لوگ مکمل طور پر ختم کرنے پر تُل گئے تھے، اور وہ اپنے بدعزائم میں سو فیصد کامیاب ہوئے۔

(ب) ناول "انواسی" میں سیاسی انتشار کی نوعیت اور اس کے اثرات

برصغیر میں اگر دیکھا جائے تو ریاست بہاول پور کو ایک اور مثالی ریاست کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔ بہاول پور وہ ریاست ہے جس کے نواب صادق نے پاکستان بننے کے بعد اس ریاست کو پاکستان میں شامل کیا۔ اس ریاست کے پاس جتنا بھی مال و متاع تھا اس کو پاکستان کے قومی خزانے میں جمع کروا دیا گیا۔ اگر ہم ریاست بہاول پور کے حوالے سے دیکھیں تو اس کے پسِ پردہ بہت سے ایسے محرکات موجود ہیں جن کی بدولت اس ریاست کو کمزور اور یہاں کے لوگوں کا استحصال کیا گیا تھا۔

دیکھا جائے تو انگریز اٹھارہویں صدی عیسوی تک برصغیر کے کونے کونے سے واقف ہوگئے اور انہوں نے اس عرصے کے دوران برصغیر میں اپنے پاؤں جما لیے تھے۔ برصغیر کے چھوٹے موٹے نواب، جاگیر دار اور سرمایہ دار و رئیس ان کے کارناموں سے بڑے متاثر ہوئے اور ان کے دلدادہ بن گئے۔ برصغیر میں انتشار اور سیاسی ماحول کی جو نئی لہر اُٹھی تھی اس میں انگریزوں کے ساتھ ساتھ سکھوں، مرہٹوں اور جاٹوں کے کرتوت بھی شامل تھے۔ برصغیر میں سیاسی بدامنی کی وجہ سے یہ ملک خانہ جنگوں کی وجہ سے بڑا

مفلوج ہو چکا تھا اس لئے یہاں کے بڑے نواب زادے اور رئیس انگریزوں کی جھولیوں میں گرتے جا رہے تھے ۔اور اس کی وجہ انتشار اور اندرونی بغاوت تھی جسے انگریزوں نے ہی پروان چڑھایا تھا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ریاست بہاول پور کو انگریزوں کی غلامی میں بدل دیتی ہے۔ ۱۸۰۸ء میں ایک انگریز حکمران نے ریاست بہاول پور کا دورہ کیا اور یہاں کے مقامی نوابین نے اس انگریز کی کی خوب خاطر مدارت کی جس کی وجہ سے وہ انگریز ان کے دل کو سمجھ گیا اس خوب خاطر مدارت اور تحفہ تحائف ان دونوں کو بہت قریب کر دیا۔

کیوں کہ اس وقت کے نواب آف بہاول پور اس سیاسی اور ملکی انتشار سے دلبر داشتہ ہو چکے تھے اور اس قدر پریشان تھے انگریزوں کے ساتھ مفاہمت کے علاوہ اس کے پاس کچھ اور چارہ نہیں تھا۔ اس لئے ریاست بہاول پور نے انگریزوں سے درخواست کی کہ وہ ریاست کو اپنی سرپرستی میں لے لیں تا کہ وہ چین اور آرام بھری زندگی گزار سکیں اس طرح اس ریاست کو بھی انگریز غلامی کے بھینٹ چڑھایا گیا۔ اور ریاست بہاول پور کی غیور عوام نے اپنے نوابین کے آرام و سکون کی خاطر خود کو اُن کے سپرد کر دیا۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں جب ریلوے انجن ایجاد ہوا تو انگریزوں نے برصغیر میں ۱۸۵۷ء کے بعد ریلوے کا ایک موثر نظام متعارف کروانے اور یہاں سے خام مال برطانیہ پہنچانے کے لیے انہوں نے برصغیر میں ریلوے لائن بچھانے کا ایک وسیع منصوبہ شروع کیا جس میں ریاست بہاول پور کے ایک وسیع علاقے کو اس میں شامل کرنے کا ایک جامع منصوبہ شروع کیا۔ یہ منصوبہ ہیڈ سلیمانکی یعنی دریائے ستلج کو پہلی دفعہ بند کرنے کا منصوبہ بھی اس میں شامل تھا اس پر عمل کرنے کے لئے انہوں نے یہاں کے مقامی لوگوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اور صرف نوابین کو اس سے آگاہ کیا اور اپنا کام شروع کر دیا۔

اس ریلوے نظام کو ریاست بہاول پور میں بچھانے کے لیے انہوں نے یہاں کے ایک موجودہ افسر جان برٹن کی خدمات کو ریاست بہاول پور کے لیے مختص کیا۔ اس سلسلے میں ریاست بہاول پور ایک سیاسی اکھاڑہ بن گئی۔ کیوں کہ یہاں کے مقامی لوگ نہ صرف روایات پر اپنی زندگی بسر کر رہے تھے بلکہ وہ اپنی اجداد کی قبروں کو بھی اپنے لیے مقدم مانتے تھے۔ ریاست بہاول پور میں انگریز سرکار نے جب ریلوے کا منصوبہ ہیڈ سلیمانکی سے دہلی جانے کے لیے تیار کیا تو انہوں نے اس منصوبے کی زد میں آنے والے بہت سے دیہاتوں کو ختم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور ریاست بہاول پور کے نوابین کو اس سے آگاہ کر کے ریاستی پولیس کا استعمال کرتے ہوئے اپنے عزائم کو پورا کرنے کی جستجو شروع کر دی۔

حفیظ اللہ کے ناول "انواسی" میں ریاست بہاول پور اور اس وقت کے حالات و واقعات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس ناول میں اس وقت کے ماحول اور کرداروں کی نفسیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس واقع کو مکمل طور پر موجودہ نسل کے سامنے عیاں کیا گیا ہے۔ اس ناول میں حفیظ اللہ نے اس وقت کے تمام سیاسی، سماجی، تہذیبی و ثقافتی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جس سے اس وقت کے لوگوں کو دوچار ہونا پڑا تھا۔ انیسویں صدی میں انجن کی ایجاد اور اس کے پھیلاؤ میں جو عمل دخل انگریزوں کا رہا اس کے بارے میں بیان کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ انگریزوں نے مقامی نواب سے مل کر اس وقت ایک انگریز جان برٹن کو اس منصوبے کا چیئرمین مقرر کیا اس کے بارے ناول میں مصنف لکھتے ہیں:

> "جان برٹن کو ہندوستان کی بود و باش تہذیبی، مذہبی، ثقافتی اور لسانی تنوع کے ساتھ ساتھ یہاں کی تاریخ، جغرافیے اور جغرافیائی تبدیلیوں سے آگاہ کیا گیا تھا۔ اسے جذباتیت سے باز رہنے اور نفاق کو اپنا رہنما بنائے رہنے کا درس الگ تھا۔ جان برٹن کے تجربے کو پیشہ وارانہ مہارت پر تو کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی تھی۔ البتہ اس کے کبھی کبھار کہ انسان دوست انتظامی فیصلوں کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھا گیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس اس پراجیکٹ میں اس کے سخت گیر بیٹے ولیم آرتھر برٹن کو بطور اسسٹنٹ اس کے تمام فیصلوں میں عملی طور پر شریک رہنے کی تنبیہہ کی جا چکی تھی"(۱۸)

دیکھا جائے تو اس سارے واقع کے پس پردہ انگریزوں نے اس ریاست کے لوگوں کو مذہبی، سیاسی اور ثقافتی طور پر اپنے ساتھ شامل کرنا تھا لیکن یہاں کے مقامی اور غیور لوگوں نے انگریزوں سے مفاہمت کی بجائے نفرت کا اظہار کیا اور اپنی ریاست کے نوابین کے فیصلوں کو اپنے اوپر لاگو کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ جس کی وجہ سے انگریز حکومت کو اس وقت کی پولیس کا استعمال کرنا پڑا جس کی وجہ سے لوگ ان سے اور زیادہ خوفزدہ ہو گئے حفیظ اللہ خان لکھتے ہیں کہ:

> "اگر جان برٹن کے فیصلے کی توثیق کمپنی میں اعلیٰ سطح پر ہو چکی تھی مگر بہاول پور کے ریزیڈنٹ مجسٹریٹ اور ملتان کے کمشنر بہادر نے اس آپریشن کی حمایت کرنے اور فوجی فورس مہیا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے نہ صرف مقامی

آبادی اور حکمران کمپنی میں کدورتیں بڑھیں گی بلکہ یہ چھوٹا سا معاملہ ملک گیر سطح پر مسلمانوں کے جذبات کو مشتعل کرنے کا باعث ہو سکتا ہے"(۱۹)

اس ناول میں سیاسی انتشار اس وقت سامنے آتا ہے جب یہاں کے مقامی لوگوں کو ان کے گاؤں اور مقامی جائیدادوں سے بلامعاوضہ فارغ کیا جارہا تھا۔اس سیاسی انتشار میں اس وقت کے مولوی اور دوسرے سیاسی رہنماؤں نے بھرپور کردار ادا کیا تھا۔بقول خالد اشرف:

"انگریزوں کے برصغیر کو چھوڑنے کے بعد ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی تو آزاد ممالک میں مغربی سیاسی اداروں کو عوام پر تھوپنے کی کوشش کی گئی، نتیجہ کے طور پر ان لوگوں نے اپنی سیاست کو نظریہ حیات بنا کر لوگوں کو استعمال کیا۔اس لئے کہ ان کی یک طرفہ حکومت آگئی تھی"(۲۰)

اس ناول میں کچھ ایسے ہی ایک مولوی کی کہانی ہے جو اس وقت لوگوں کو محض اس لیے اکساتا رہا اور لوگوں کو مذہبی حوالے سے غلط راہ دکھلاتا رہا۔ہوا کچھ ایسے کہ ستلج ہیڈ سلیمانکی کی مقامی آبادی کو اپنا علاقہ خالی کرنے کا حکم دیا گیا تو ان کے آباؤ اجداد کے قبرستان سے ایک ریلوے لائن کا نقشہ پاس ہوا تھا لیکن مولوی کو انگریز حکومت کی طرف سے کچھ نہ ملنے کی وجہ سے اس نے ان لوگوں کو انگریز حکومت کے خلاف کر دیا اور بعد میں اپنے خیالات کو تبدیل کر کے انگریزوں کی حمایت کرنے لگا مصنف مولوی حاکم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"حاکم ضروری نہیں کہ آپ کا اپنا ہم مذہب ہو وہ جس مذہب سے بھی ہو اسے حاکم رب کی ذات نے بنایا ہے اور اس کے کہے ہوئے کی تکمیل رعیت پر فرض ہے ان صاحبان نے نوجوانوں پر واضح کر دیا کہ وہ لوگ جو بے شک اپنے ہوں یا پرائے اگر آپ کو بغاوت اور فساد پر آمادہ کریں تو سمجھ لیں کہ وہ آپ کے کھلے دشمن ہیں آپ کی ہلاکت کا باعث ہیں"(۲۱)

دوسری طرف مولوی جار اللہ کا جو فتویٰ تھا وہ سیدے اور اس قبیلے نے اپنی جان سے بھی مقدس سمجھا اور اس کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے سے بھی پیچھے نہیں ہٹے تھے مولوی جار اللہ ایک طرف تو انگریز حکومت کے ساتھ تھا لیکن دوسری طرف مولوی جار اللہ سنگری کی محبت کو اپنے لیے بے حد مقبول سمجھتا تھا۔

اس نے وہاں کی مقامی آبادی کو ختم ہوتے دیکھا تو اس کو اپنے کیے کی فکر ہونے لگی کیوں کہ مولوی اور اس کا کنبہ اس آبادی کی وجہ سے شاہانہ زندگی بسر کر رہے تھے مولوی جاراللہ نے جو فتویٰ دیا وہ کچھ اس طرح لوگوں کے دلوں میں میں مقید ہو گیا تھا۔

"مولوی جاراللہ کا دیا ہوا فتویٰ سیدے کے مخالفوں کے حوصلے پست کیے ہوئے تھا کہ قبرستان سے لاش نکالنا میتوں کی توہین صرایحاً کفر اور گناہ کبیرہ ہے"(۲۲)

ان سب باتوں کے باوجود یہاں کے مقامی لوگ اور نوجوان خاص طور پر اپنے اجداد کی قبروں کو مسمار ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے انگریز حکومت کے خلاف اعلان جنگ کیا تو انہوں نے یعنی انگریزوں نے ریاست کی طاقت کو استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا۔ بقول ڈاکٹر عبدالسلام: "برطانوی لبرل ازم پر قائم ہندوستانی جمہوریت ظاہری طور پر مذہب پرست، فوجی آمریت اور سیاسی انتشار برصغیر پر سامراجی اقتدار بنا۔"(۲۳)

لیکن داروغہ یہاں کا مقامی تھا اس لیے وہ اپنوں سے بغاوت کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن ریاست اور آئین کے خلاف کام کرنا داروغہ کی جان لے سکتا تھا۔ اس لئے داروغہ نے چپ چاپ ان کا حکم ماننے کے لئے خود کو تیار کر لیا اور اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"داروغہ اگرچہ اس زمرے میں مقامی ہی تھا کہ اس کا تعلق ملتان سے تھا مگر اس کی خاکی وردی کی طرف آنکھ بھر کر دیکھنا ایسا ہی تھا کہ جیسے انگریز سرکار کو آنکھیں دکھانا اور سرکار کو آنکھیں دیکھانے کی سزا آنکھوں کو نکالے جانے سے کسی طرح بھی کم نہیں تھی"(۲۴)

ان سب معاملات کے باوجود اگر دیکھا جائے تو مولوی جاراللہ بھی اپنے موقف سے پیچھے ہٹا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس نے نوجوانوں اور مقامی لوگوں کو جس طرح انگریز حکومت کے خلاف یکساں کیا تھا اب وہ خود ان کے اشاروں پر کام کر رہا تھا۔ اس کے بارے میں سیدے کے خیالات کچھ اس طرح کے ہیں۔ "سیدے کو یقین ہو گیا تھا کہ مولوی صاحب اپنا راستہ بدل چکے ہیں"(۲۵)

دیکھا جائے تو اس ناول کے تمام کردار ایک دوسرے سے الگ سوچ کے متحمل نظر آتے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی کردار ہیں جو اپنے مفاد کے لیے دوسروں سے بغاوت اور نفرت کو پروان چڑھا رہے ہیں۔ مولوی جاراللہ بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی تھی جو اپنے مفادات اور سیاسی پشت پناہی کی بدولت لوگوں کو بار بار نئے نظریات سے دوچار کر رہا تھا۔ اس پر ان سادہ لوح انسانوں کا یقین تھا اور وہ بھی پہاڑ کی طرح پختہ اور مضبوط لیکن مولوی اندر سے بالکل مفاد پرست اور خود غرض انسان تھا۔ بقول ڈاکٹر فاروق عثمان:

> "ہمارے نوابین نے جن کے ذہنی اور نظریاتی رشتے عوام اور مٹی سے پیوست ہونے کے بجائے مغربی آئینی و سیاسی نظریہ ساز اداروں سے زیادہ استوار تھے۔ نتیجہ کے طور پر برصغیر کے ناخواندہ و پسماندہ عوام کی اکثریت اور ان کے نمائندوں کے درمیاں روز بروز خلیج بڑھتی گئی"(۲۶)

انواسی ناول کا سیاسی ماحول ہمیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور نو آبادیاتی نظام سے دوبارہ سے جوڑ دیتا ہے۔ انگریز جس طرز پر برصغیر میں آئے وہی طرز اپناتے ہوئے انہوں نے مختلف ریاستوں کو اپنے ساتھ شامل کیا اور وہاں کے لوگوں کا مقامی سیاستدانوں کے ساتھ استحصال کروایا۔ دیکھا جائے تو وہی طریقہ تھا جو انگریزوں نے برصغیر کے مقامی غیور لوگوں کے ساتھ کیا تھا۔ انگریزوں نے لوگوں کو غلامی کے ساتھ ساتھ ان کی عزتوں کو برباد کر دیا" انواسی" میں حفیظ اللہ لکھتے ہیں کہ:

> "گورے آفیسروں نے لڑکی کو زبان بند رکھنے کی دھمکی دے کر اس کے پاس کچھ نقد رقم بھی پھینک دی تھی مگر لڑکی نے اپنی جھگی میں جا کر جو بیتی تھی سب سنادی"(۲۷)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حفیظ اللہ نے نہ صرف ریاست بہاول پور کے سیاسی احوال کو بیان کیا ہے بلکہ وہاں کے غیور اور عزت دار لوگوں کی غیرت کو بھی اپنے ناول میں بیان کیا ہے۔ اس تمام محرکات کو دیکھا جائے تو اس کے پس پردہ کچھ اور ہی روایت چلی آ رہی تھی۔ اس ریاست پر اور برصغیر پر انگریزوں نے نسل در نسل حکمرانی کی ہے۔ جس کی مثالیں جابجا اس ناول میں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ جس سے اس ریاست کی حکمرانی اور نوابین کے بارے میں مکمل آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ بہاول پور میں جو ریلوے لائن بچھائی جا رہی تھی اس میں بھی نسل در نسل کی روایت چلی جا رہی تھی۔ اس کے حوالے سے حفیظ اللہ لکھتے ہیں کہ:

"سنڈی ریلوے کمپنی کا سابق چیف ریذیڈنٹ جسٹس انجینئر جان برٹن انڈس ویلی اسٹیٹ ریلوے میں شمولیت کے بعد اپنے بیٹے اور معاون ولیم آرتھر برٹن کے ہمراہ بہاول پور میں کمپنی کے ریسٹ ہاؤس میں کئی دنوں سے پہنچا ہوا تھا لیکن ہمت نہیں ہو پا رہی تھی کہ چھوٹی سی بستی کے ساکنان کا سامنا کر سکے"(۲۸)

ریاست بہاول پور کے ساتھ ساتھ ساتھ اس کے مضافاتی علاقوں کو بھی انگریزوں نے اپنے ساتھ شامل کرنے کا منصوبہ بنایا اور مضافاتی علاقہ جات میں صوفیائے کرام کی سرزمین ملتان کو بھی انہوں نے اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ وہاں انہوں نے مذہبی اور سجادہ نشین لوگوں کو ان کے آباء کی محنت اور برکات سے محروم کر دیا اور وہاں بھی اپنی اجارہ داری قائم کر دی تھی اس سلسلے میں حفیظ اللہ لکھتے ہیں کہ:

"ملتان فتح کرنے کے بعد جب سکھوں اور انگریزوں نے ریاست بہاول پور پر چڑھ مار کرنے کی کوشش کی تو ان کی یلغار کو مقامی نوابین نے ناکام بنانے کی بھرپور کوشش کی لیکن وہ ناکام رہے"(۲۹)

بہاول پور میں انگریزوں یعنی گوروں کی حکومت نے جب اقتدار کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنا شروع کیا تو انہوں نے یہاں کے مذہبی لوگوں کو استعمال کرتے ہوئے عوام کا استحصال کرنا شروع کر دیا اور یہاں کے قدیم دیہاتوں کو بھی اور ان کی رسم ورواج اور روایات کو پامال کرنے کی کوشش کی تو یہاں کے غیور لوگوں نے ان تمام روایات اور رسوم کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ انگریزوں نے مقامی چوھدریوں سے مل کر وہاں کے لوگوں کو اپنا غلام بنانے کی کوشش کی لیکن وہ ہر حد تک ناکام رہے کیونکہ یہاں کے لوگوں نے اپنے نمبر داروں کے احکامات کو ماننے سے انکار کر دیا اور اپنے عقائد اور رسوم و روایات سے انحراف کرنے سے انکار کر دیا۔ جس کی واضح مثالیں ہمیں اس ناول میں ملتی ہیں۔ انگریزوں نے سب سے پہلے اس ریاست کا استعمال اس لیے کیا کہ وہ اپنے ذاتی مفادات کے لیے اور برصغیر کے زرخیز علاقوں سے خام مال کی رسائی لندن تک یعنی ریلوے کے ذریعے کراچی کی بندرگاہ تک پہنچا سکیں گے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ان نواحی علاقوں میں ریلوے کا نظام شروع کر دیا۔ لیکن اس نظام میں مقامی لوگوں کی بستیاں اور قبرستان بھی آرہے تھے جن کو مقامی لوگوں نے کسی بھی صورت میں مسمار ہونے سے بچانا تھا اور اس سلسلے کے لیے وہ کوئی بھی قیمت لینے سے انکار کر رہے تھے جب کہ انگریزوں کو اس بات کی کوئی پرواہ نہیں تھی کہ وہ

اپنے عقائد و رسومات کے بارے کیا سوچتے ہیں۔ اس بارے میں حفیظ اللہ لکھتے ہیں کہ: "گورا صاحب نے ان کے اجداد کی قبروں پر لوہا بچھانا ہی بچھانا تھا۔ ان کی ہڈیاں چاہے کتے کھائیں، کوے یا چیلیں، ہونی کو ٹالنا ممکن نہیں۔"(۳۰)

ریاست بہاولپور کی بد قسمتی اس وقت شروع ہوتی ہے جب انیسویں صدی میں دخانی انجن کی ایجاد کا سہرا انگریزوں نے اپنے سر پر باندھا۔ اس لیے پہلے پہل وہ برصغیر سے خام مال صرف اور صرف سمندری حدود یا اس کے مضافاتی علاقوں سے اکٹھا کرتے تھے لیکن انجن کی ایجاد نے ان کے نظریات کو یکسر بدل دیا تھا۔ اب ان کی نگاہیں برصغیر کے ان علاقوں پر جا لگیں جہاں خام مال کی فراوانی تھی اور انگریز اس کو حاصل کرنے سے قاصر تھے لیکن انجن کی ایجاد نے ان کو ایک نیا تجارتی ہتھکنڈا اعطا کر دیا جو ان کو برصغیر کی بربادی کے لئے کئی صدیوں سے چاہیے تھا۔ ناول سے ایک مثال دیکھیے:

> "انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں دخانی انجن کی ایجاد نے پہلے ہی یورپ میں انقلاب برپا کر رکھا تھا لہذا کیسے ممکن تھا کہ اسے برطانیہ کے زیر نگیں نو آبادیاتی خطوں تک توسیع نہ دی جاتی"(۳۱)

برصغیر کی اہم ریاست بہاول پور کا انتخاب ہی کیوں کیا گیا سب سے پہلے ریلوے کے نظام کے لیے اس کے بارے میں بھی اس ناول میں بتایا گیا ہے۔ کیونکہ برصغیر پر انگریزوں کے ساتھ ساتھ ان لوگوں نے بھی یلغار کی تھی جو مسلمان تو تھے لیکن وہ افغانی تھے جو صرف اور صرف برصغیر پر حملہ یہاں کی دولت لوٹنے کے حوالے سے کرتے تھے۔ انگریز بھی سولہویں صدی سے اس تماشہ کو دیکھ رہے تھے کہ ان کے مال و متاع کس طرح وہ لوٹ رہے ہیں اور یہاں کے حکمران اپنی عیاشی بھری زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جس طرح انہوں نے برصغیر پر حملہ کیا تھا۔ اس ریلوے پراجیکٹ کے بارے میں اور انگریز سرکار کے نظریے کے بارے میں حفیظ اللہ لکھتے ہیں کہ:

> "یہ کمپنی دراصل اس بڑے پراجیکٹ کا ایک جزو تھی جس کے تحت لاہور جیسے معاشی مرکز کو کراچی کی بندرگاہ سے اس طرح جوڑنا تھا کہ جیسے اس سے قبل افغانستان سے آنے والے حملہ آوروں نے اسے غزنی کی شمالی گزرگاہوں سے جوڑ رکھا تھا"(۳۲)

اس پراجیکٹ کے لیے انگریز حکمرانوں نے یہاں کے مقامی لوگوں کا استعمال کیا ان کو معمولی اجرت دے کر اپنے کام کے لیے استعمال کرتے رہے۔ ان کو کم اجرت دے کر وہ زیادہ کام لے رہے تھے اس کے پس پردہ ریاست بہاول پور کی غریب عوام کا استحصال بھی کار فرما تھا۔ اس غریب عوام کو معمولی رقم کا لالچ دے کر ان کو محنت مزدوری کے لئے استعمال کرنے کا ہنر صرف اور صرف انگریز حکمران ہی جانتے تھے کیونکہ اس سے پہلے یہاں صرف زرعی زمینوں پر ان مزدوروں سے کام لیا جاتا تھا جو صرف کچھ دن کے لئے سال میں اپنے لئے کام کر سکتے تھے۔ لیکن جہاں انگریزوں نے ان کو اپنے رُعب اور دبدبے کی وجہ سے کام کرنے پر مجبور کر دیا اور مقامی نوابین کی بدولت وہ لوگ مجبور ہو کر ان کی غلامی میں آ گئے۔ حفیظ اللہ اس ناول میں مزدوروں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> "یہ معاملہ خاص طور پر اس لیے بھی اہم تھا کہ اس کی ٹیم کے جونیئر ارکان اور اجرتی مزدور مقامی لوگوں میں سے تھے جو صرف انگریز سرکار کے دبدبے کے سبب کام کرنے کو تیار ہوئے تھے اور اگر یہ دبدبہ بھی باقی نہیں رہتا تو اسے اپنے کام کی تکمیل کے واسطے دستیاب انسانی وسائل کہاں سے مہیا ہو سکیں گے "(۳۳)

لیکن دوسری طرف اگر دیکھا جائے تو وہاں کے وہی مزدور ہی ان کے خلاف تھے جب وہ لوگ ان کے آباء کی قبروں سے ریلوے لائن گزار رہے تھے۔ لیکن جب وہ ریلوے لائن ان قبروں کے قریب آئی تو انہوں نے انگریزوں کے خلاف یکجا ہو کر ان کے ہاں کام کرنے کی بجائے ان کے خلاف ایک سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔ جس کی وجہ سے انگریزوں کو وہ کام بند کرنا پڑا اور وہی لوگ ان کے دشمن بن گئے۔ اس حوالے سے ناول میں لکھا ہوا ہے کہ:

> "بظاہر ان کی نگاہ میں انگریز سرکار کا کروفر اور دبدبہ باقی نہیں رہا تھا۔۔۔ مزدوروں کا اجتماعی طور پر فرار ہو جانا سنڈی ریلوے کمپنی اور اس کے باقی افسروں کے مقدر کو گہنا سکتا تھا۔۔۔۔ وگرنہ کیسے ممکن تھا کہ انتظامی لحاظ سے انتہائی حساس مقامات سے ریلوے لائن گزارنے اور بہاول پور تک پہنچ جانے والی کمپنی ان مٹھی بھر شر پسندوں کے سامنے ہتھیار پھینک کر بیٹھ جائیں۔ (۳۴)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں کے مقامی لوگوں نے جس سیاست کو پروان چڑھا کر انگریزوں کو اپنی عوام پر حکومت کرنے کا حکم دیا تھا اب وہی انگریز اس حکمرانی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ کیونکہ ان کے ظلم و ستم سے وہاں کے لوگ اپنے آقاؤں کے بارے میں جان گئے تھے۔ اب انہوں نے اپنے آقاؤں کی بھی قدر نہیں کی بلکہ ان کے فیصلے کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے۔ بقول عبدالسلام:

"محمود غزنوی سے لے کر تقسیم برصغیر تک آٹھ نو صدیوں کے دوران ہندو مسلم تعلقات کی عہد بہ عہد بدلتی ہوئی مخلوط و منفصل فضا میں انگریزوں کا کردار لافانی رہا ہے"(۳۵)

اس لیے انگریز حکومت بھی سہم گئی انہوں نے ان کی طرف دوبارہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست بہاول پور انگریزوں کے آنے سے مقامی نوابین کی حکومت بھی کمزور ہو گئی تھی۔ اس سلسلے میں کچھ دن کام بند رہنے کی صورت میں انگریز حکومت نے ریاستی طاقت کے استعمال کا سوچا اور قبرستان اور ان علاقوں میں فوج نافذ کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ اس کے متعلق حفیظ اللہ "انواسی" میں رقم کرتے ہیں کہ:

"ملتان کور سے آئی ہوئی فوج رات ایک بجے بستی آدم واہن کو کارڈن آف کر لے گی اور جب تک لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا قبرستان کا وہ حصہ جہاں سے ریلوے لائن گزرنی ہے علیحدہ سے فوج کی نگرانی میں رہے گا"(۳۶)

دوسری طرف اب عوام نے بھی اپنی حفاظت کرنے کا فیصلہ خود کر لیا تھا اور ریاستی نوابین کی طرف سے کسی بھی قسم کی امداد کے منتظر نہیں رہے۔ لیکن ان کے خلاف انگریز حکومت نے بھی سختی سے نمٹنے کا فیصلہ کر لیا اور وہاں کے لالچی لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان کو پیسے دے کر ان کو ہی قبرستان کی بربادی کے لئے استعمال کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اب فیصلے کو مد نظر رکھ کر انہوں نے دوبارہ سے وہاں کام کرنے کا فیصلہ کر لیا اور وہاں کے لوگوں کو آخری وارننگ کے ساتھ گاؤں خالی کرنے کا حکم دیا لیکن انگریزوں کی جو سازش تھی اس کے بارے میں حفیظ اللہ لکھتے ہیں کہ:

"انتظامیہ کو کبھی انڈرایسٹیمیٹ نہیں کرتے۔ اس کے کام کرنے کا اپنا طریقہ کار اپنا انداز ہوتا ہے۔ اس میں اتاول نہیں کی جاتی بلکہ دشمن کے خود ہی اپنے جال میں پھنسنے

کا انتظار کیا جاتا ہے۔ اور وہاں صبح دیکھنا قبرستان کو ہم نے نہیں بلکہ خود ان لوگوں نے مسمار کرنا ہے کہ جو اس کے باقی رہنے کے لئے اپنی جانیں دینے کے لئے تیار تھے "(۳۷)

ان تمام سازشوں کے باوجود بستی آدم واہن کے شمال مغربی علاقے میں گوروں نے ایک نئے قبرستان کی بنیاد رکھی اور لوگوں کو اطلاع دی کہ اس قبرستان سے اپنے آباء کی ہڈیوں کو اکٹھا کر کے اس قبرستان میں دفن کر دیں اس حوالے سے انہوں نے مولوی جار اللہ سے ایک فتویٰ بھی جاری کروایا جس کے تحت لوگوں نے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ حفیظ اللہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"ان میں سے اکثر نے تو بغاوت چھوڑ دی ہے اور جو باقی بچ گئے ہیں ان کی قبروں کے لیے بستی کے شمال مغرب کی طرف سے بننے والے نئے قبرستان میں کافی جگہ رکھ دی گئی ہے "(۳۸)

انگریز نئی نسل کو نئے نئے خواب دیکھا رہے تھے انہوں نے نئی نسل کو ان کے اچھے اور روشن مستقبل کے حوالے سے آگاہی دینے کی بھرپور کوشش شروع کر دی تھی جس کی وجہ سے بستی آدم واہن کے لوگ کئی گروہوں میں منقسم ہو گئے تھے۔ انگریزوں نے ان لوگوں کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے ان کو کمزور کر دیا اور اپنے عزائم کو پورا کرنے کی جستجو میں لگ گئے تھے۔ نئی نسل کو ورغلانے کے حوالے سے حفیظ اللہ انگریز کے خیالات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"ان دریاؤں نے کبھی کسی انسان کو اپنے اوپر پُل نہیں بنانے دیا لیکن ان دو جڑواں دریاؤں ستلج اور بیاس کو مسخر کرنے جا رہا ہوں ان پر لوہے کا پل بنا کر "(۳۹)

دوسری طرف دیکھا جائے تو یہ انگریزوں کی حکمت عملی ہی تھی جس نے اس ریاست کو انتشار سے بچا کر اپنے مفادات کو حاصل کیا تھا۔ اس کے بارے میں حفیظ اللہ لکھتے ہیں کہ "یہ گورا سرکار ہی تھی کہ جو ہر قیمت پر اپنے مقبوضہ علاقوں میں حالات کو جمود میں رکھنا چاہتی تھی" اس سارے ناول میں بستی آدم واہن کے دو گروہوں کا ذکر ہے۔ جس میں اس علاقے کی دو نوجوان ایک لڑکی کی وجہ سے ایک دوسرے کے جانی دشمن بنے ہوئے تھے۔ سید ا اور سکندر نامی دو لوگوں کی لڑائی نے اس بستی کے آرام و سکون کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے انگریز بھی اپنے عزائم میں ان دونوں کی لڑائی کی وجہ سے کامیاب ہو گئے۔ انگریزوں نے دونوں کے

درمیان لڑائی کو کوہوادی اور سیدا کو سکندرے کے بارے میں بھڑکا دیا جس کی وجہ سے سیدا سکندرے کا جانی دشمن بن گیا۔ انگریزوں کی اس حکمت عملی کے بارے میں حفیظ اللہ "انواسی" میں لکھتے ہیں کہ:

"آدھے گھنٹے سے بھی کم مدت میں میں ہیڈ آفس کو اطلاع بھجوادی گئی تھی جس میں اتنی سی گنجائش ضرور رکھی گی کہ مزاحمتی جتھے کا اگوان اپنے قریبی سکندرے ماچھی ابھی تک مردہ یا زخمیوں میں شناخت نہیں ہو سکا تھا لیکن پوری بستی آدم، واہن عملی طور پر اس وقت گورا فوج کی تحویل میں تھی"(۴۰)

اس سارے منظر یا ماحول کے پیچھے مختلف لوگوں کے مفادات جڑے تھے ان مفادات کے حصول کی خاطر بہت سارے لوگوں کا آرام و سکون اور گھروں کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ سکندرے اور سیدے کی لڑائی، مولوی کا مال کی عوض فتویٰ بدلنا اور انگریزوں کا اپنے لیے بے تحاشہ سرمایہ اکٹھا کرنا اس ناول میں جابجا دیکھا جا سکتا ہے۔ اس سارے ماحول کے بارے میں کچھ اس طرح حفیظ اللہ لکھتے ہیں کہ:

"ان کے مطابق حاکم کی طرف سے کیا جانے والا ہر وہ کام لائق ستائش ہے جس میں خلق کی بھلائی مضمر ہو ایسے عمور میں رکاوٹ ڈالنا اور لوگوں کو اس کے خلاف بھڑکانا کھلی بغاوت ہے جس کی کوئی بھی سزا دی جاسکتی ہے لوگوں کی وہ اکثریت جو سیدے اور اس کے ساتھیوں کی مخالفت رہی تھی مولوی صاحب کی گفتگو سے بہت خوش ہوئی مگر ان کے چہرے سوال بن کر گئے کہ جو اس سے قبل ان کا فتویٰ انہی کی زبانی سن چکے تھے"(۴۱)

بستی آدم واہن کے لوگ عقائد اور نظریات کے پکے تھے ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو بستی میں چھوٹے موٹے مسائل پر کبھی کبھار لڑ پڑتے تھے لیکن گاؤں میں دریا کے کنارے لگنے والے میلے میں سب ایک دوسرے کو معاف کر کے اپنے اس بزرگ کے سامنے وعدہ کرتے تھے ہم اب سے کبھی بھی اختلاف نہیں کریں گے۔ انگریز حکومت نے ان لوگوں کو اس میلے کے دوران ختم کرنے کا فیصلہ کیا جنہوں نے ان کے ساتھ بغاوت کی تھی۔ "ہندوستان میں سامراجی نظام کی بنیاد پڑنے سے قبل جاگیر دارانہ نظام کار فرما تھا"(۴۲)

دوسری طرف سیدا اس میلے میں حاضری تو دیتا ہے لیکن بھیس بدل کر اور وہاں سے بچ نکلتا ہے۔ کیونکہ سیدے نے کھلم کھلا بغاوت کی جس کی وجہ سے نوجوان نسل میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کا عنصر پروان چڑھ گیا تھا۔ اس کے بارے میں لوگوں کا خیال تھا کہ:

"اکثریت کا خیال تھا کہ اگر سید ازندہ ہوا بھی تو زندگی بھر بستی میں قدم نہیں رکھ سکے گا
کیونکہ انگریز کبھی بھی اپنے باغیوں کو سلامت نہیں چھوڑتے"(۴۳)

اس ناول کے اختتام میں وہ تمام محرکات ختم ہو جاتے ہیں جو انگریز حکومت کے خلاف سازش یعنی لوگوں کو بغاوت پر اکسا رہے تھے۔ مولوی جاراللہ کی شہادت، سیدے کو قتل کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ انگریزوں نے دریا کا سارا پانی بستی کی طرف چھوڑ دیا جس کی وجہ سے لوگوں کو یہاں سے نقل مکانی کرنا پڑی تھی اس سیلاب کی وجہ سے ان کے گھر اور قبرستان کو بھی ختم کر دیا گیا۔ اس سارے نظام سے انگریزوں نے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے مون سون کی بارشوں کا انتظار کیا جس میں انہوں نے ان تمام لوگوں کو پانی میں بہا کر اپنے عزائم میں کامیاب ہونا تھا۔

"سیلاب کی اچانک آمد کے پیچھے انگریزوں کی سازش کار فرما ہے جو نہیں چاہتے تھے کہ
یہ بستی اور یہاں کے لوگ ان کے عزائم میں مزاحم ہوں"(۴۴)

اس تمام بحث سے اس ناول کے وہ تمام سیاسی محرکات واضح ہو جاتے ہیں جو ریاست بہاول پور میں انگریزوں کی آمد کے ساتھ شروع ہوئے تھے۔ اس آمد کی وجہ سے نوابین نے تو سکون حاصل کیا لیکن یہاں کے مقامی لوگوں نے اس انتظامی تبدیلی سے بہت سا نقصان اٹھایا جس کی وجہ سے انگریزوں کی انا اور ان کی برصغیر میں اجارہ داری تھی۔ اس ریاست کے تمام امور کو ان کے حوالے کر کے نوابین بھی اپنی رعایا سے باغی ہو گئے کیوں کہ اس وقت وہ سیاہ و سفید کے مالک اور اس ریاست کے نئے حکمران تھے۔

اس باب میں ناول "انواسی" کے حوالے سے ان تمام سیاسی امور کو زیر بحث رکھا گیا ہے جو اس ریاست کے نظام کو ختم کرنے کے لیے انگریزوں کی حکمتِ عملی کے طور پر بنائے گئے تھے۔

(ج) ناول "انواسی" میں سیاسی بیانیے کی انفرادیت

ناول "انواسی" میں سیاسی بیانیے کی انفرادیت پر بات کرنے سے پہلے ہمیں سیاست کا پرچار کرنا ہو گا۔ یہ سیاست ہے کہ جس کے تحت اس ناول میں سیاسی بیانیے کے جائزہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ سیاست سے مراد ایسا گروہ جو عوام کی رائے یا مرضی سے ان پر حکومت کرتا ہے۔ ہر ریاست میں اس کی معیاد مقرر ہوتی ہے اس کے بعد عوام نئے حکمران کا چناؤ کرتی ہے۔ "انواسی" ناول میں بھی عوام کسی طرح نوابین کی غلامی سے انگریزوں کی غلامی اختیار کرتے ہیں اس کے بارے میں حفیظ اللہ نے جابجا اپنے خیالات کا اظہار بہاول پور کی تاریخ کو مدِ نظر رکھ کر کیا ہے۔ اس ناول میں کہانی پن سے زیادہ بہاول پور ریاست کی تاریخ ملتی ہے۔

اس ناول میں بہاولپور ریاست کے حوالے سے ایک الگ اور منفرد طرز کا سیاسی بیانیہ ملتا ہے۔ اس میں ایک حکمران جماعت کے ہوتے ہوئے اور ایک جماعت لوگوں پر حکمرانی کرنے کی خواہش رکھتی ہے۔ لیکن عوام ان کو دل سے ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ حفیظ اللہ کے اس ناول میں سیاست کا دوغلا پن بھی دیکھنے کو ملے گا، کہ اس طرح ایک انگریز حکمران کا بیٹا اپنے مخالفین سے جا ملا اور اس کے رد عمل کے طور پر اس کا باپ کس طرح اس کی وضاحت بیان کرتا ہے۔

> "میرا بیٹا اور اس کے ساتھ میرے دشمن ولیم گالوے کا خاص ایجنٹ ہے۔ میرا بیٹا اگر میرے مخالفین کے ساتھ دوستی کر سکتا ہے تو وہ کچھ بھی ہو سکتا ہے"(۴۵)

اس طرح سے ایک الگ سیاسی بیانیے کی انفرادیت ہمیں اس ناول میں جابجا ملتی ہے۔ اس ناول میں سیاست کے ان تمام پہلوؤں کو مد نظر رکھا گیا ہے جس کی بدولت ایک سیاست دان اپنی حریف جماعت کو شکست سے دوچار کرتا ہے۔ اس لئے جان کا بیٹا مخالفین کے ساتھ جا ملا ہے کہ وہ اپنے باپ کو ایک مستحکم جماعت کے بانی کے طور پر ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ اس کے اپنے بیٹے کے بارے میں خیالات کچھ اس طرح کے ہیں:

> "جان کے بیٹے کو محسوس ہوا کہ اسے ذلیل کیے جانے کا عمل شروع کیا جا چکا ہے کہ جس کا پہلا قدم ایک جونیئر آفیسر کے روبرو اُس کے پیش ہونے کا بلاوا آیا ہے"(۴۶)

دوسری طرف اس ناول میں باپ کی سوچ کے برعکس بیٹا کام کر رہا ہے، وہ مخالفین کے ساتھ شامل ہو کر اپنے باپ کا جانی دشمن بن چکا ہے۔ وہ اپنے باپ کے نظریات سے اختلاف کرتا ہے، اور شدت پسندوں کے نظریوں کا حامی دکھائی دیتا ہے اس طرح ان کے نظریے پر عمل کر کے وہ اپنے باپ اور اس کی جماعت کے لیے ایک نیا خطرہ بن کر ابھرتا ہے۔

اس طرح اس ناول میں روایتی سیاست سے بالکل برعکس سیاسی نظریے کو اس ریاست کے لوگوں پر پروان چڑھایا جا رہا تھا۔ اس لئے کہ یہاں کے لوگوں نے پہلی دفعہ ہی انگریزوں کے نظریے کے خلاف بغاوت کا عنصر پیش کیا تھا جس کی وجہ سے انگریز سرکار کے ساتھ ساتھ مقامی حکمران جماعت بھی عوام کے سامنے بے بس دکھائی دے رہے تھے۔ جان اپنے بیٹے ولیم اور ایما کو ایک موقع دیتا ہے کہ وہ راہِ راست پر آجائیں لیکن وہ اس کے برعکس ہی کام کرتا ہے۔ "جب سے سامراجی نظام سامنے آیا ہے اس کی افادیت میں سیاسی انتشار کو نیا جنم مل گیا ہے۔"(۴۷)

دوسری طرف جان کی محبوبہ بھی جان کو اس قدر بے مروت پا کر اس کے خلاف کھڑی ہو گئی کہ اب وہ اس کے ساتھ پہلے جیسا سلوک اور برتاؤ نہیں کر رہا اس لیے وہ جان کی سیاست اور اس کے نظریے کی خاطر لوگوں کو قائل کرنے میں خود کو صرف کرنے لگی۔

> "نہ جانے کیوں وہ نہیں چاہتی تھی کہ جان جیسا باکمال انجینئر دفتری سازشوں کا شکار ہو۔ اسے اپنی حدود کا بھی علم تھا اور اس معاملے کی حساسیت کا بھی کہ جس میں وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنا آپ الجھا بیٹھی تھی"(۴۸)

دوسری طرف وہ اپنی بیوی کی جدوجہد دیکھ کر اس کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑنے کی کوشش دوبارہ سے کرنے لگا اس طرح اس ناول میں سیاست ایک الگ حیثیت سے اپنی پہچان بنانے لگی۔ دوسری طرف مخالفین نے اس کے بیٹے کو مکمل طور پر اپنے حامی کے طور پر ظاہر کر دیا تو جان کے لئے اور اس کی سیاسی جماعت کے لیے ایک بڑا دھچکا تھا جس کو جان کے بوڑھے اور ناتواں کندھے کبھی بھی کسی صورت برداشت کرنے سے قاصر تھے۔ اس سارے منظر میں جان کی بیوی ہی اس میں خود اعتمادی کا جذبہ پروان چڑھانے لگی۔

> "آخر تم ہی کیوں مجھے بچاتی پھرتی ہو ایسے میں کہ جب میرا بیٹا بھی ذہنی طور پر مخالف کیمپ کے لوگوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے"(۴۹)

دوسری طرف مخالف جماعت کے لوگوں نے اپنا نیا سربراہ جان کے بیٹے گالوے کو ظاہر کر دیا جس سے جان کے اندر ایک نئی سیاسی جنگ نے جنم لینا شروع کر دیا تھا۔ اس سارے منظر میں جان اور اس کی بیوی نے مخالفین کا بھرپور انداز میں مقابلہ کیا اور اور ان کے نظریات کو عوام میں مقبولیت سے دور کیا۔ لیکن جان کا بیٹا اب یہ چاہتا تھا کہ بہاول پور کی تاریخ میں اس کو ہمیشہ یاد رکھا جائے اور اس کے باپ کو لوگ بھول جائیں اس دوڑ میں باپ کو شکست دیے بغیر بیٹا اپنے سیاسی عزائم میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ "وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ تاریخ کے صفحات میں میر ایعنی جان برٹن کا نام کھرچ کر اپنا نام لکھوا دے۔ "(۵۰)

دوسری طرف دیکھا جائے تو مقامی لوگوں میں دو نوجوانوں کے درمیان اپنے قبیلے کی سربراہی کے حوالے سے جنگ جاری تھی۔ منگر اور سَیدا ایک دوسرے کے مخالف تو تھے لیکن دونوں خون کے پیاسے بھی تھے۔ ان دونوں کی کی اَنا نے کافی حد تک بستی کا سکون محال کر دیا تھا جس کی وجہ سے بستی کے لوگوں کو اپنے علاقائی فیصلے ایک مذہبی جماعت کے پیشوا کے سامنے پیش کرنے پڑتے تھے۔ ان کی چپقلش کی وجہ سے انگریز بیانیہ اس علاقے میں ترقی کا رہا تھا۔ ان دونوں کی قبیلے سے دوری انگریز حکمرانوں کو ان پر قابض ہونے کی راہ دکھا رہی تھی۔ "مولوی جاراللہ کا دیا ہوا یہ فتویٰ سَیدے کے مخالفوں کے حوصلے پست کیے ہوئے تھا"(۵۱)

دوسری طرف ریاست بہاول پور میں اندرونی سیاسی محرکات کی وجہ سے دوسری ریاستوں کے حکمرانوں نے اس ریاست کے کمزور سیاسی بیانیے کے پسِ پردہ خود کو ان کا حکمران ظاہر کرنے کی جستجو شروع کر دی تھی۔ لیکن انگریزوں کے سیاسی مقاصد میں مقامی ریاست کے حکمران کسی بھی ریاست کو فتح نہیں کر سکتے تھے اس لیے جب سکھوں نے ریاست بہاول پور کے علاقے ملتان پر حملہ کیا تو انگریزوں نے اس حملے کو ناکام بنا کر یہاں خود کو مضبوط ظاہر کیا۔

> "ملتان فتح کرنے کے بعد جب سکھوں نے ریاست بہاول پور پر چڑھ مار کی کوشش کی تو ان کی یہ یلغار انہی گوروں کی وجہ سے ناکام ہوئی تھی "(۵۲)

دوسری طرف جب ریاست بہاول پور کے حکمرانوں نے اپنی ریاست کی طرف غیروں کو حملہ کرتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے انگریزوں سے ناراضگی کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ آج تک کسی نے بھی ہمارے ریاست کی طرف نظر اٹھانے کی کوشش نہیں کی لیکن ہماری اندرونی لڑائی کی وجہ سے مخالفین نے ہم

پر شب خون مارا ہے۔ اس بارے میں نواب صادق اپنی رعایا کے سامنے اپنا سیاسی نظریہ کچھ اس طرح پیش کرتا ہے۔

> "حاکم ضروری نہیں کہ آپ کا اپنا ہم مذہب ہو وہ جس مذہب سے بھی ہو اسے حاکم رَب کی ذات نے بنایا ہے اور اس کے کہے ہوئے کی تکمیل رعیت پر فرض ہے۔ اُن صاحبان نے نوجوانوں پر واضح کر دیا کہ وہ لوگ جو بے شک اپنے ہوں یا پرائے اگر آپ کو بغاوت اور فساد پر آمادہ کریں تو سمجھ لیں کہ وہ آپ کے کھلے دشمن ہیں۔ آپ کی ہلاکت کا باعث ہیں"(۵۳)

ان تمام اقتباسات سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ ریاست بہاول پور انگریزوں کی آمد کے بعد ایک نئے سیاسی نظریے کے تحت آگے بڑھ رہی تھی لیکن یہ بہت سے سیاسی بیانیے اور نظریات پروان چڑھ رہے تھے۔ جس میں فتح انگریز بیانیے کی ہوتی ہے جو دولت کی بنا پر لوگوں کے دلوں پر نہیں بلکہ ان کے جسموں پر حکمرانی ثبت کر رہے تھے۔ اس سیاسی بیانیے میں چار بیانیے سامنے آتے ہیں جن میں مقامی بستی کے سربراہ، انگریز، مذہبی رہنما اور حملہ آوروں کے نظریات شامل ہیں۔

اس تمام بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس ناول میں جو سیاسی صورت حال بیان کی گئی ہے یہ اپنی طرز کی الگ اور منفرد بیانیے کے طور پر سامنے آتی ہے۔ اس ناول کا تمام تر احاطہ یہی سیاسی بیانیہ ہی کرتا ہے جو اس کی سرزمین پر یکے بعد دیگرے کئی نظریات کو اپنے اندر سے سموتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس سے ہم اس ناول میں ایک الگ سیاسی بیانیے کو اپنی انفرادیت کے حاصل ہونے کا دعویٰ بڑے وثوق کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔

حوالہ جات

1۔ شان الحق حقی (مرتبہ)، فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۲۰۰۸ء، ص ۶۴۸

2۔ مشرف احمد، راجندر سنگھ بیدی کا تنقیدی مطالعہ، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص ۱۹۵

3۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، (مؤلف) قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، ص ۱۵۱۱

4۔ محمد طاہر، ڈاکٹر، ریاست بہاول پور کا نظم مملکت، بزم ثقافت، ملتان، ۲۰۱۰، ص ۹۷

5- ایضاً، ص ۱۰۲

6- شہاب دہلوی، مسعود حسن، ''بہاول پور کی سیاسی تاریخ''، مکتبہ الہام، بہاول پور، ۱۹۷۷، ص ۱۶

7- محمد طاہر، ڈاکٹر، ریاست بہاول پور کا نظم مملکت، بزم ثقافت، ص ۱۰۶

8۔ زاھد علی، سید، ڈاکٹر، بہاول پور کی سر زمین، بیکن بکس، ملتان، ۱۹۹۹ء، ص ۶۱

9۔ محمد حفیظ خان، انواسی، ص ۲۰۸

10۔ اسلم آزاد، ڈاکٹر، اردو ناول آزادی کے بعد، نریندر ناتھ، دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۲۵

11۔ محمد حفیظ خان، انواسی، ص ۲۱۰

12۔ ایضاً، ص ۲۱۵

13۔ ایضاً، ص ۲۱۵

14۔ اسلم آزاد، ڈاکٹر، اردو ناول آزادی کے بعد، نریندر ناتھ، دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۷

15۔ محمد حفیظ خان، انواسی، ص ۲۸۳

16۔ ایضا، ص ۳۲۹

17۔ صالحہ زریں، اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ، سرسوتی پریس، الہ آباد، ۲۰۰۰ء، ص ۹۱

18۔ محمد حفیظ خان، انواسی، ص۱۵

19۔ ایضاً، ص۲۴

20۔ خالد شریف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص۲۳۳

21۔ محمد حفیظ خان، انواسی، ص۵۴

22۔ ایضاً، ص۵۷

23۔ عبدالسلام، ڈاکٹر، اردو ناول بیسویں صدی میں، اردو اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۳ء، ص۱۷۰

24۔ محمد حفیظ خان، ص۱۷۶

25۔ ایضاً، ص۵۹

26۔ فاروق عثمان، ڈاکٹر، اردو ناول میں مسلم ثقافت، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۰۰ء، ص۳۱۰

27۔ محمد حفیظ خان، انواسی، ص۳۶

28۔ ایضاً، ص۱۳

29۔ ایضاً، ص۸

30۔ ایضاً، ص۸

31۔ ایضاً، ص۱۴

32۔ ایضاً، ص۱۴

33۔ ایضاً، ص۲۵

34۔ ایضاً، ص۳۴

35۔ عبدالسلام، ڈاکٹر، اردو ناول بیسویں صدی میں، ص۲۳۰

36۔ محمد حفیظ خان، انواسی، ص۸۸

37۔ ایضاً، ص۸۸

38۔ ایضاً، ص۸۸

39۔ ایضاً، ص۹۰

40۔ ایضاً، ص۹۹

41۔ ایضاً، ص۱۰۱

42۔ ایضاً، ص۱۱۶

43۔ ایضاً، ص۳۲۹

44۔ ایضاً، ص۱۲۵

45۔ ایضاً، ص۱۲۵

46۔ ایضاً، ص۱۲۵

47۔ یوسف سرمست، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اردو ناول، ص۱۷۰

48۔ محمد حفیظ خان، انواسی، ص۱۴۰

49۔ ایضاً، ص۱۵۷

50۔ ایضاً، ص۱۵۹

51۔ ایضاً، ص۵۷

52۔ ایضاً، ص۸

53۔ ایضاً، ص۵۴

باب پنجم

ماحصل

مجموعی جائزہ

محمد حفیظ خان ایک زمانی اور جغرافیائی اکائی میں دو متوازی بیانیے تخلیق کیے ہیں۔ ان میں سے ایک بیانیہ بستی آدم واہن کا ہے اور دوسرا بیانیہ اس سے دو کلو میٹر سے بھی کم کے فاصلے پر موجود انڈس ریلوے کمپنی کے کیمپ آفس کا ہے۔ آدم واہن کے بیانیے کا بیشتر حصہ واقعاتی ہے جبکہ کیمپ آفس کے بیانیے کا بیشتر حصہ نفسیاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدم واہن کے مکینوں کے مسائل خارجی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور کیمپ آفس کے کرداروں کے مسائل نفسیاتی الجھنوں اور اندرونی سازشوں سے متعلق ہیں۔ ان دونوں بیانیوں کو محمد حفیظ خان نے الگ الگ رکھا ہے۔

ناول "انواسی" حفیظ خان کے نمائندہ ناولوں میں سے ایک ہے۔ زیرِ مطالعہ ناول "انواسی" اپنے مخصوص بیانیے، کردار نگاری اور دوسرے فنی لوازم کے ساتھ ساتھ فکری حوالے سے بھی ایک اہم تحریر ہے یہ ناول اپنے اندر بیک وقت کئی اہم عناصر کو سموئے ہوئے ہے۔ "انواسی" میں بہت سی گمشدہ اور تلخ حقیقتوں کا بیان ملتا ہے، ناول کی مجموعی فضا میں مخصوص ثقافتی رنگوں کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی تاریخی شعور بھی ملتا ہے۔ جنوبی پنجاب خصوصاً بہاول پور کی ثقافت کی عکاسی ملتی ہے۔ ناول کا قصہ دریائے ستلج کے کنارے آباد ایک بستی آدم واہن کے گرد گھومتا ہے ان لوگوں کے کے ذریعے ناول نگار نے اس پوری تہذیب کا المیہ بیان کیا ہے۔ لوگوں کی زندگی محض پیٹ پالنے کی حد تک محدود تھی وہ بس دو وقت کی روٹی کو ہی اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے تھے اور اس پر بہت خوش تھے۔ اور دریا ہی ان لوگوں کا ذریعہ معاش تھا جس میں سے وہ مچھلی کا شکار کر کے اپنی خوراک پوری کرتے تھے۔ ان لوگوں میں دو طرح کے جرائم تھے رسہ گیری (چوری کرنا) اور بازو نکالنا (لڑکی اغواہ کرنا) اور مویشی دریائی بستیوں کی معیشت کی بنیادی اکائی سمجھے جاتے اور اغواہ ہو جانا کوئی خاص جرم نہیں سمجھا جاتا تھا جس پر جاگیر دار اور زمیندار اپنی مرضی سے لڑکیوں کو اغواہ کرتے جس پر کوئی آواز نہ اٹھاتا۔ یہ معاشرہ لڑکیوں کے اغواہ ہو جانے پر تحفظ فراہم کرنے میں ناکام تھا جس پر وہ لڑکیوں کا جلد نکاح یا منگنی کر دیتے اور اس ذمہ داری سے آزاد ہوتے۔ اس میں معاشرے کو بے نقاب کیا گیا ہے جس میں عورت

بھی کسی کے ساتھ بھاگ جانے یا اغواہ ہو جانے کو کوئی بُرا فعل تصور نہیں کرتی کیوں کہ یہ سب اس معاشرے کا حصہ بن چُکا ہے اور غیرت نیلام ہوتی نظر آرہی ہے۔

اس دریا پہ پل کی تعمیر کی غرض سے موجود انگریزوں کے بیان سے ناول نگار نے سامراجی قوتوں کی حکمرانی کو بھی عیاں کیا ہے۔ غاصب طاقتیں کس طرح محکوم لوگوں کی جان ومال سے کھیلتی ہیں، اپنی حکمرانی کو استحکام دینے کے لیے مختلف حربوں کو آزمایا جاتا ہے۔ ناول کا قصہ شروع ہی اسی تناظر میں ہوتا ہے کہ انگریز حکومت دریا کے کنارے آباد بستی آدم واہن کے مکینوں کے ساتھ نبرد آزما ہے۔ انگریزی تسلط میں وہاں کی رعایا بے شمار مظالم کے ساتھ ساتھ عدم تحفظ کا بھی شکار تھی۔ آئے دن انہیں مختلف طرح کی صورت حال سے نبرد آزما ہونا پڑتا اس طرح ان کے اندر ایک عجیب طرح کا خوف گھر کر گیا اور وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے۔ اور اگر جب کبھی کسی کو اس بات پر بہت زیادہ تشویش ہوتی تو وہ شکایت کرنے جاتا تو اس کی سنی نہ جاتی اور انہیں اپنے استحصال پر احتجاج کا حق تھا۔ کمپنی کی طرف سے ریل کا ٹریک (پٹڑی) بچھائی جارہی ہے اس میں مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب گاؤں کا قدیم قبرستان اس کی زد میں آجاتا ہے۔ بستی والوں کا اس حوالے سے شدید ردعمل سامنے آتا ہے۔ لوگ اگرچہ انگریز حکومت کی طرف سے سے خائف تھے لیکن اکثریت مقابلے کے لئے تیار تھی۔ عقائد و نظریات کا تعلق خواہ مذہب سے ہو یا ثقافت سے لوگ اس کی خاطر مرمٹنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً مشرق میں ایسے نظریات پہ سمجھوتا نہیں کیا جاتا

یہاں کے لوگ لاشوں کی حرمت کا خیال رکھیں نہ رکھیں مگر اپنے قبرستانوں کی حرمت پر مرمٹنے کو تیار ہو جاتے ہیں، اور جہاں یہ کسی مذہبی بات پر حاکمِ وقت کے خلاف اکٹھے ہو جائیں تو انہیں اپنی بات سے ہٹانا ممکن نہیں رہ جاتا۔ کشتویوں کا پتن بستی کی معیشت کے لیے ناگزیر تھا اور انگریز اپنے تجارتی مفادات کی لالچ میں اس کی اس اہمیت کی طرف توجہ نہیں دے رہے تھے۔ پتن کی نہ صرف گاؤں کے لوگوں کے لیے اقتصادی اہمیت تھی بلکہ وہ ان کی سماجی زندگی کا حصہ بن چکا تھا۔

اگرچہ انگریزوں کی طاقت کے سامنے بستی کے چند غریب لوگوں کی ایک نہ چلتی لیکن وہ اس بات سے کشمکش کا شکار تھے کہ کہیں اس چھوٹے سے واقع سے ملک گیر مسلمانوں کی احتجاج کی صورت میں مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے۔ وہ مولوی جاراُللہ سے اس معاملے کے حل کی کوئی راہ نکالنے کے منتظر تھے۔ تاکہ جانی نقصان کم سے کم ہو مولوی جار اللہ کی شخصیت بھی اتنی پراسرار تھی کہ کسی کو بھی ان کے سامنے انکار بولنے کی جرات نہ تھی۔ مولوی جار اللہ کی صورت میں برصغیر کے ثقافتی عوامل کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ سادہ لوح

اور خوش عقیدہ ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ باہر سے آنے والوں کے اثرات کو قبول کیا اور اس کے بدلے ان کو استحصال کا سامنا کرنا پڑا۔ لوگوں کے دلوں میں عقیدت کا بلند و بالا تصور قائم کر کے ان کے ذہنوں پہ ایسا کنٹرول حاصل کیا جاتا ہے کہ وہ ان کی نافرمانی کو اپنے لئے باعثِ عذاب تصور کرنے لگ جاتے ہیں، یہ وہ سطح ہے جس کے بعد ان کے مذہبی پیشواؤں کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی وہ اپنے مقاصد کو بڑی مسرت سے حاصل کر لیتے ہیں۔

انگریزوں نے بستی والوں کو اپنے بزرگوں کی قبروں سے باقیات نکال کر دوسری جگہ منتقل کرنے کا کہا اور ان کے انکار کی صورت میں یہ کام خود کرنے کا عندیہ دیا۔ گاؤں کے لوگوں کا رفتہ رفتہ ملا جلا ردِ عمل سامنے آیا۔ بالآخر وہ دن قریب آ ہی گیا جب مردوں کی باقیات کو منتقل کرنا تھا، انگریز سرکار کی طرف سے قبرستان کا گھیراؤ کر لیا گیا اور کسی بھی لمحے میں حتمی کارروائی عمل میں لائی جا سکتی تھی۔ ایسے میں مولوی کا کردار اپنی پراسرار رویے کے ساتھ پھر نمودار ہوا انگریزوں نے حملہ کر کے قبرستان کے گرد سیدے اور اس کے ساتھیوں کا حصار توڑ ڈالا کئی جوان اس حملے میں مارے گئے۔ "سیدا" ان میں شامل نہ تھا اور نہ ہی اس معاملے میں کسی کو علم تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے، انگریز اپنے کام میں مزید تاخیر برداشت نہیں کر سکتے تھے اس لیے انہوں نے اس کام کو مکمل کرنے کے لیے بستی والوں کی مزاحمت کو بہت آسانی سے کچل دیا۔ اس میں مولوی کا کردار بہت اہم ہے۔ نماز کے بعد مولوی صاحب نے نہایت مدلل انداز میں لوگوں کو تحمل سے رہنے کی تلقین کرتے ہوئے انہیں حاکموں کی اطاعت کا فریضہ یاد رکھنا، ان کے مطابق حاکم کی طرف سے کہا جانے والا ہر کام لائق ستائش ہے کہ جس میں خلق کی بھلائی مضمر ہو ایسے امور میں رکاوٹ ڈالنا اور لوگوں کو اس کے خلاف بھڑکانا کھلی بغاوت ہے۔ جس کی کوئی بھی سزا دی جا سکتی ہے۔ یہاں تک کہ اس نے ان نوجوانوں کی موت جو دراصل ایسے مذہبی اور ثقافی ورثے کے اصل محافظ تھے کو حرام قرار دیا۔

مولوی نے کہا کہ میرے نزدیک انہوں نے خودکشی کی ہے اس لیے ان کا جنازہ بھی جائز نہیں۔ انگریزوں کی طاقت سے ٹکر لینا کہاں کی عقل مندی ہے۔ خودکشی ہی تو ہے۔ تم لوگ بھی کوئی عقل کرو خودکشی نہ کرو۔ اس واقعے کے بعد سیدے کی کسی کو خبر نہ ہوئی وہ زندہ ہے یا مردہ اس بارے میں محض قیاس آرائیاں تھی اس کے سوا حقیقت کچھ نہیں تھی۔ سیدے کی سنگری نامی لڑکی سے بچپن میں بات چلی تھی جسے عرفِ عام میں نکاح کا نام دیا جاتا تھا جو بچپن میں ہی ہو چکا تھا۔ یہ لڑکی اپنی خوبصورتی اور ناز و ادا کے لحاظ سے گاؤں کی نمایاں لڑکیوں میں سے تھی، جسے دیکھ کر گاؤں کے نوجوانوں سمیت بڑے لوگوں کے دلوں میں بھی اس کی خوب صورتی

کے خوب صورت خیال آتے لیکن سیدے کی منکوحہ ہونے کی وجہ سے کسی کو اس کی طرف دیکھنے کی بھی ہمت نہ تھی۔ سیدا اپنے سماجی ڈھانچے میں اتری ہوئی عورت مخالفت کی بنیاد پر یہ سمجھنے میں ناکام تھا کہ وہ غلط ہے۔ الٹا وہ اس کی ذمہ داری بھی سنگری پر ڈالتا تھا۔ قبرستان میں آپریشن سے قبل سیدہ سنگری کی طرف سے کی گئی بے عزتی کے بدلے کے لئے اسے اٹھا کر لے جاتا ہے۔ اسے اپنا حق سمجھ کر اس کی انا کو ٹھیس پہنچا کر اپنی اَنا کو تسکین دینا چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی عورت کو اس کی مرضی کے خلاف اٹھالینا کوئی جرم نہیں تھا۔ سیدے نے سنگری کو اغوا کرنا تمام مسائل کا حل سمجھا اور اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا اور اسے ایک بار بھی ایسا نہیں لگا کہ اس نے سنگری کو اغوا کر کہ کوئی جرم کیا ہے یا کوئی غلطی کی ہے۔ سنگری کے اندر ایک طرح کا تانیثی شعور اسے ایسے سوال اٹھانے پر مجبور کرتا تھا جو معاشرے میں مردانہ جبر کی حیثیت پر چوٹ کرتے تھے۔ بنیادی طور پر سنگری کی تربیت میں یہ چیز شامل تھی کیوں کہ اس نے ایک ایسے معاشرے میں پرورش پائی تھی جہاں ہمیشہ عورت کو اپنے حق کی خاطر لڑنا پڑا یا اسے اپنے حق کی خاطر کوئی نہ کوئی ناجائز قربانی دینا پڑی۔ معاشرے کے اسی رویے کی بدولت سنگری جیسی عورت نے جنم لیا اور معاشرے میں مزید خرابیوں کا راستہ کھولا۔ اسی بدشگونی کے خیال کا مظاہرہ تب بھی نظر آیا جب ایک مظلوم لڑکی کو بھی منحوس قرار دے دیا گیا جو کہ زیادتی کا شکار ہوئی تھی۔ یہ کہا جانے لگا کہ کس قدر منحوس لڑکی ہے وہ کہ پہلے دو نوجوان انجینئرز کے ساتھ پل بھر کے لئے مَس ہوئی تو دونوں کو ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے اور آج چند لمحوں کے لیے اُس کے ساتھ دیکھی گئی تو زندگی بھر کا کیا دھرا داغدار اور ملازمت انکوائری کے کٹہرے میں۔ سنگری کے ساتھ رات گزار کر وہ اسے پھینک کر چلا جاتا ہے۔ لیکن اصل مسئلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب اسے اپنے رحم میں ایک بچے کا وجود محسوس ہوتا ہے معاشرے میں اس کا انجام کیا ہوگا ہوگا اس کو سوچ کر وہ ڈر جاتی ہے کہ وہ کیسے معاشرے کے سوالوں کا جواب دے گی۔ کیا ایسے میں وہ معاشرے میں زندہ بھی رہ سکے گی۔ یہاں عورت کا استحصال بھی دکھائی دیتا ہے۔

سنگری اپنا مزید استحصال کروانے کے بجائے ایک ہی بار کسی بااثر شخص کے نکاح میں جا کے خود کو محفوظ بنانا چاہتی ہے۔ تاکہ لوگ اس کو نہ تو کوس سکیں اور نہ ہی اس کے کردار کے بارے میں بول سکیں۔ مولوی صاحب ہی اس کو اس مسئلے سے بچا سکتے تھے۔ مولوی صاحب اس اچانک وار کے لیے تیار نہ تھا۔ سَنگری کی یہ گفت گو معاشرے کی منافقت کو عیاں کرتی ہے مولوی جار اللہ کی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ اپنے پڑھائے ہوئے نکاح کے دعوے سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ بالآخر مولوی جاراللہ سنگری کو اپنے نکاح میں لے لیتا ہے،

سات ماہ بعد بچے کی پیدائش ہوتی ہے خاموشی سے اسے اپنی اولاد قبول کر لیتا ہے۔ قبرستان کے معاملے میں ایک فساد اس وقت کھڑا ہوتا ہے جب سال بعد عرس کے موقع پر چالیس درویش آتے ہیں اور اپنے شہیدوں کی قبروں کی عدم موجودگی ایک نئے ہنگامے کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ مذہبی اور سماجی عقائد جب مل جائیں تو ان کی آویزشیں ایک ایسے گہرے جنون کو پروان چڑھاتی ہے جس کے سامنے رکاوٹ ڈالنا بہتے دریا کے سامنے ریت کا پل بنانے کے مترادف ہے۔ بستی اور ارد گرد کے علاقے میں مختلف مسالک کے لوگ تھے۔ مولوی جاراللہ کا تعلق اسی مسلک سے جو ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا تھا جو ہر سال آکر زندہ پیر کرامت کا عرس مناتے تھے۔ درویش دہائی دے رہے تھے کہ اگر واقعی شہیدوں کی قبروں کی بے حرمتی کی گئی ہے تو اس میں اب آدم کا ٹھکانہ ممکن نہیں رہا ان کے نزدیک شہیدوں کی قبروں کی حفاظت نہ کر سکنا بھی ان کی بے حرمتی ہی تھی۔ اسی دوران کسی نے وہاں خبر اڑادی کہ سات شہیدوں کی قبروں کو مسمار گرا کر ان کے آثار مٹانے میں مولوی جاراللہ کا ہاتھ ہے کہ جو مخالف مسلک کے پیروکاروں کا کرنا دھرنا ہونے کے ساتھ ساتھ پیر زندہ کرامت کے میلے کو بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ ایسے موقع پر لوگ عقل اور انسانیت کے اوصاف سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یوں وہ ایسے انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے مولوی جاراللہ کے ہجرے میں جانے لگے۔ مولوی صاحب حجرے میں ہی موجود تھے دیکھتے ہی دیکھتے ہیں ہجوم مولوی کے حجرے کے پاس پہنچ گیا۔ لوگوں نے پتھر برسانا شروع کر دیے، کچھ لوگ آگ جلانے کے لیے گھاس اور جھاڑیاں بھی جمع کرنے لگے چند لمحوں بعد آگ کے شعلے ہر طرف بھڑک اٹھے۔ کچھ لوگوں نے آگے بڑھ کر مولوی کو ہجوم سے باہر کھینچا اور اس پر ڈنڈے برسانے شروع کر دیئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مولوی صاحب کو جان سے مار دیا۔ مولوی کی عزت و تکریم کرنے والے لوگوں نے ان کے زنان خانے کو بھی جلا دیا۔ مولوی کے مر جانے کے بعد اس کی وراثت اور جانشینی کا مسئلہ پیش آیا اور سنگری کو بھی پھر سے ایک محافظ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مولوی اللہ بخش مولوی جار اللہ کے بعد اس کا جانشین بن جاتا ہے۔ بخشو نے آہستہ آہستہ سنگری کی خبر گیری کے لئے آنا شروع کر دیا۔ مولوی بخشو کا رفتہ رفتہ آنا بڑھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں حیوانیت بہت اُبھر کر سامنے آرہی تھی۔ مولوی بخشو اپنی حیثیت کو استعمال کرتے ہوئے اس بے سہارا لڑکی کا استحصال کرنا چاہتا تھا وہ اعلانیہ طور پر اس کو اپنا نہیں سکتا نہیں سکتا اور نہ ہی اس کی اجازت اسے معاشرہ دے سکتا ہے۔ لیکن وہ اس کا نکاح کسی لاچار شخص کے ساتھ کر کے اسے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ جب سنگری نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا تو اس نے اُسے حرامزادی اور بدکردار ثابت کرنا شروع کر دیا۔ مصنف نے خوب صورتی کے ساتھ بہاول پور کی

ثقافت کو پیش کیا ہے۔ مرد کی حکمرانی، مذہب کی غلط تشریح اور مذہب اور عقیدت کے پیرائے میں غریبوں کے استحصال کو بڑی عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مولوی بخشو کا منفی کردار ناول کے آخر تک موجود رہتا ہے۔ جو محض اپنے ذاتی مفادات اور آسائش کو ملحوظِ خاطر رکھے ہوئے ہے۔ سنگری کو اب مولوی بخشو سے بچنے کے لئے ایک ہی راستہ نظر آیا کہ وہ مولوی اللہ رکھا جو مولوی جار اللہ کا چھوٹا بھائی اور بھتیجے مولوی بخشو سے عمر میں زیادہ بڑا نہیں تھا سنگری نے مُلا رکھے کو ان تمام حربوں سے اپنا ہمدرد اور رہنما بناتے ہوئے مؤدبانہ انداز اور جذباتی کیفیات کے سہارے مولوی بخشو کی بدنیتی کو بیان کر دیا۔ وہ گھبراہٹ کا شکار ہونے کے باوجود اس بات پر راضی ہو جاتا ہے کہ وہ سنگری سے نکاح کر لے۔ لیکن اس بار بھی قسمت سنگری کا ساتھ نہیں دیتی اور مُلا اللہ رکھا چند دن بعد مر جاتا ہے اور اس کا الزام بھی سنگری کے سر پر آجاتا ہے۔ مولوی بخشو کا کردار ناول کے اختتام تک موجود رہتا ہے۔ جو اپنے متنازع کردار اور شخصیت کے ساتھ موجود رہتا ہے۔

ناول کے اختتام پہ سیلاب کی وجہ سے وہ بھی تمام لوگوں کی طرح مصائب کا شکار ہو جاتا ہے۔ ناول کے اختتام پر مصنف نے ایک ڈرامائی انداز میں سیلاب کی وجہ سے تمام لوگوں کو برابر کر دیا سب اپنی بقا کی جنگ لڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں امیر و غریب کی تخصیص تو درکنار انسانیت بھی معدوم ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ موت ایسی حقیقت ہے جو انسان کو انسان سے بے نیاز کر دیتی ہے اور شاید یہی وہ وقت ہے جب انسان کے سامنے اصل حقیقت بھی آشکار ہو جاتی ہے۔ ناول "انواسی" میں بہاول پور کی سیاسی صورت حال میں اس وقت اتار چڑھاؤ دیکھا جا سکتا ہے جب انگریزوں نے مقامی حکومت کے ساتھ مل کر یہاں کے لوگوں کا استحصال کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس ناول میں جابجا دیکھا جا سکتا ہے کہ انگریز کس حد تک انسانیت کی تذلیل صرف اور صرف اپنی اجارہ داری کے لئے کرتے ہیں۔ ان تمام وجوہات کی وجہ سے یہاں کے لوگ جب مقامی نوابین کا حکم نامہ بھی مسترد کرتے دیکھے گئے تو نوابین نے انگریز حکومت کو فری ہینڈ دے دیا۔ انگریز ایک طاقت ور قوم تھی اور وہ بستی آدم واہن کے رہنے والوں کو انسان بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی نظروں میں وہ بہت حقیر تھے یہاں تک کہ انگریز جب چاہیں ان کی عزتیں بھی پامال کرتے جن پر بستی والے ان کے خلاف احتجاج کرتے پر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ وہ اس قدر طاقت اور ہمت نہیں رکھتے تھے۔ اَنا پرستی کے محرک کی وجہ سے انگریزوں نے بستی کے لوگوں پر ظلم و ستم کے انبار لگا دیے یہاں کے لوگ بنیادی ضروریات زندگی کے لیے بھی ترس رہے تھے لیکن انگریزوں کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ وہ کسی بھی صورت اس بستی کے قبرستان سے ریلوے لائن کو ضرور گزاریں گے۔ جب انگریز حکومت مکمل طور پر بے بس ہو گئی تو

یہاں کے لوگوں کا مکمل طور پر قلع قمع کرنے کے لیے انہوں نے ایک جامع منصوبہ بنایا کہ یہاں کے لوگوں کو ہم سیلابی موت عطا کرتے ہیں۔ ان کے گھر بار کو، فصلوں کو، جانوروں کو، اور مکانات وغیرہ کو پانی میں بہا دیتے ہیں۔ یہ لوگ مجبور ہو کر ہمارے پاؤں میں گر پڑیں گے اور ہم ان کے اوپر احسان کے ذریعے غلامی کی زنجیر ڈال دیں گے۔ اس تمام صورت حال کو جب انگریزوں نے مکمل طور پر بھانپ لیا تو وہ اس کے لئے خود کو تیار کرنے لگے۔ انہوں نے اپنی تمام تر توجہ بستی سے مکمل طور پر ہٹا کر ہیڈ سلیمانکی کے برج پر مرتکز کر دی۔ تاکہ اس کی جلد سے جلد تکمیل کی جائے اور برسات کے دنوں میں آنے والے پانی کو بستی کی طرف موڑ دیا جائے کیوں کہ یہ لوگ پانی کے آگے بے بس ہو جائیں گے اور خود بخود یہاں سے کسی اونچی جگہ اپنا نیا مسکن تلاش کریں گے، اور ہم سیلابی صورت حال کے بعد اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکیں گے۔ اس سارے قصے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انگریزوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے یہاں کے لوگوں کا بجا استحصال کیا ہے۔ جس کی وجہ سے یہاں انتشار اور بغاوت کی ایک نئی صورت حال نے جنم لیا تھا لیکن انگریزوں نے آخری حد تک جانے کی ہر ممکن کوشش کی اور اپنی سیاسی بصیرت کی بدولت اور اپنے بدتر عزائم میں کامیاب ہو گئے۔ اس ناول کا تمام تر احاطہ یہی سیاسی بیانیہ ہی کرتا ہے جو اس کی سرزمین پر یکے بعد دیگر کئی نظریات کو اپنے اندر سے سموتا ہوا نظر آتا ہے۔

محمد حفیظ خان نے اپنے کرداروں کے منظر نامے کے لئے زندہ ماضی کا انتخاب کیا ہے۔ یہ ایسا ماضی ہے جس کے حالات و واقعات اور مسائل حال سے اس سے زیادہ متعلق ہیں جتنا آج کے میڈیا یا مذاکرات اور خبر نامے۔ دریا کے اس طرف کے بیانیے کے قرائن ۱۸۷۲ء ہی کے ہیں۔ انگریز کیمپ کے بیانیے کے معاشرتی رویے اور نفسیاتی مسائل ان لوگوں کی ترجیحات کے آئینہ دار ہیں جو اپنی وفاداریوں کے نتیجے میں بیرونی آقاؤں کی مراجعت کے بعد مسند اختیار سنبھال لیتے ہیں۔ یہ لوگ آج بھی طاقت اور سازش کے زور پر آدم واہن جیسی اکثریتی آبادی پر حکومت کر رہے ہیں۔ طاقت کا یہ انتقال کے مابعد نو آبادیاتی مطالعے اور نو استعماری رویے کی شناخت میں معاون ہے۔

تحقیقی نتائج

1۔ ناول انواسی کی سماجی انفرادیت یہ ہے کہ ناول نگار نے اس ناول میں بہاولپور کی ایک بستی آدم واہن کے سماج کی تصویر اس طرح پیش کی ہے کہ اسے پڑھ کر قاری پورے بہاولپور کی سماجی صورتِ حال سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ ناول میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ کس طرح انگریزوں کی آمد نے یہاں کے مقامی باشندوں کو ذہنی اور سماجی حوالے سے متاثر کیا، اور اس کے ساتھ ساتھ مقامی مذہبی اور مقتدر قوتوں نے کس طرح انگریزوں کا آلہ کار بن کر مقامی آبادی کی معاشی اور سماجی استحصال کی راہیں ہموار کیں۔

2۔ ناول انواسی میں پیش کردہ کردار زیادہ تر ایک ان پڑھ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے افعال اور ان افعال کے پیچھے کارفرما اپنے ذہنی رویوں کی مکمل عکاسی کرتے ہیں۔ ان کرداروں کا کسی بھی تہذیبی اور تمدنی فیصلے کا انحصار ایک نام نہاد مولوی یا جاگیر دار کے احکامات پر منحصر نظر آتا ہے۔ ان کرداروں کو صرف اپنی زندگی جینے سے سروکار ہے چاہے اس کے لیے اپنی عزت ہی کیوں نہ گنوانی پڑے۔ اس کے علاوہ چند ایسے کردار بھی ہیں جو بہت زیادہ انگریزی استحصال کا شکار ہیں اور اپنی ہی زندگی سے متعلق فیصلوں سے عاری نظر آتے ہیں ۔ اور کچھ کردار ایسے بھی ہیں جو اپنے فیصلوں پر کاربند رہتے ہیں اور جان کی پرواہ نہیں کرتے۔

3۔ ناول انواسی مجموعی طور پر یہ ایک جاندار ناول ہے جو ایک خاص دوارنیے میں بہاول پور کے خطے کی پیشکش میں سماجی، سیاسی اور معاشرتی تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ اس عہد میں استعماری قوتوں کے نظامِ استحصال کی واضح تصویر بھی پیش کرتا ہے۔ اور ناول انواسی کی یہی انفرادیت اسے اپنے عہد کے دوسرے ناولوں سے منفرد کرتی ہے۔

4۔ انواسی میں سماجی مسائل، معاشی و اقتصادی، استحصال اور بالخصوص عورت کے جنسی استحصال اور مرد کی حوس پرستی کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ پدرسری معاشرے میں عورت کے مقام کا تعین اور اس کے بنیادی انسانی حقوق کی پامالی کے مذہبی اور توہماتی سماجی بیانیوں کی پُر درد تصویر کشی ناول کا خاصہ ہے۔

5۔ مذہبی اور ثقافتی وابستگی کو استعماری قوتوں کے خلاف بغاوت اور ان قوتوں کی بیخ کنی کا حقیقی ذریعہ بھی اس ناول کے اختتام میں دکھایا گیا ہے۔

سفارشات

درج بالا تحقیق نتائج کی روشنی میں درج ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ حفیظ خان کے ناول انواسی میں تانیثی عناصر موجود ہیں جن پر تحقیق کی گنجائش ہے۔

۲۔ ناول انواسی کے اندر بے شمار تاریخی حوالے موجود ہیں جن پر تاریخیت اور نو تاریخیت کے حوالے سے تحقیقی کام کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ حفیظ خان کے تمام ناولوں میں سرائیکی خطے کی ثقافت کی پیشکش پر بھی تحقیق کی جاسکتی ہے۔

۴۔ حفیظ خان کی تحریروں میں سرائیکی ذخیرہ الفاظ اور محاورات پر لسانی تحقیق کی گنجائش بھی موجود ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ

محمد حفیظ خان، انواسی، ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان، ۲۰۱۹ء

ثانوی ماخذ

آمنہ مفتی، آخری زمانہ، الفیصل پبلشرز، ۲۰۱۱ء

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی (مرتبہ) کشاف تنقیدی اصطلاحات (طبع دوم)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء

ارشد محمود، ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ، سٹی پریس، کراچی، ۲۰۱۲ء

اسلم آزاد، ڈاکٹر، اردو ناول آزادی کے بعد، نکھار پبلی کیشنز، دسمبر ۱۹۸۱ء

انور پاشا، ڈاکٹر، ہندو پاک میں اردو ناول، (تقابلی مطالعہ)، پیش رو پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء

انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں (ابتدائے اردو سے ۱۹۷۵ء تک)، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۹ء

بانو قدسیہ، حاصل گھاٹ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء

خالد شریف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۵ء

زاھد علی، سید، ڈاکٹر، بہاول پور کی سرزمین، بیکن بکس، ملتان، ۱۹۹۹ء

سہیل بخاری، اردو ناول نگاری، ہمالہ بک ہاؤس، دہلی، ۱۹۷۲ء

سہیل بخاری، ڈاکٹر، ناول نگاری اور ناول کی تاریخ و تنقید، مکتبہ میری لائبریری، لاہو، ۱۹۶۶ء

شہاب دہلوی، مسعود حسن، ''بہاول پور کی سیاسی تاریخ''، مکتبہ الہام، بہاول پور، ۱۹۷۷ء

صالحہ زریں، اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ، سرسوتی پریس، الہ آباد، ۲۰۰۰ء

عبداللہ، سید، ڈاکٹر، کلچر کا مسئلہ، علمی پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۷۷ء

عصمت اللہ شاہ، (مرتب) حفیظ خان کی تخلیقی جہتیں، ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ۲۰۱۰ء

عبدالسلام، ڈاکٹر، اردو ناول بیسویں صدی میں، اردو اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۳ء

علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ اور تنقید، لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۴ء

فاروق عثمان، ڈاکٹر، اردو ناول میں مسلم ثقافت، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۰۰ء

فیض احمد فیض، ہماری قومی ثقافت، ادارہ یادگارِ غالب، کراچی، ۱۹۷۶ء

محمد شیراز، ڈاکٹر، ساسا، عکس پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۹ء
محمد طاہر، ڈاکٹر، ریاست بہاول پور کا نظم مملکت، بزم ثقافت، ملتان، ۲۰۱۰

محمد افضال بٹ، ڈاکٹر، اردو ناول میں سماجی شعور، پُورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء
محمد عاصم بٹ، بھید، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء
محمد حسن، ڈاکٹر، شعر نوح، فروغ اردو، لکھنو، ۱۹۶۱ء
مبارک علی، ڈاکٹر، جاگیر داری اور جاگیر دارانہ کلچر، مشعل بکس، لاہور، ۱۹۹۶ء
محمد نعیم ورک، اردو ناول کا ثقافتی مطالعہ، کتاب محل، لاہور، ۲۰۱۹ء
محمد حفیظ خان، رَت جگوں کی مراد، ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان، ۲۰۱۶ء
مستنصر حسین تارڑ، قلعہ جنگی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲
مشرف احمد، راجندر سنگھ بیدی کا تنقیدی مطالعہ، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۸ء
نیلم بشیر احمد، طاؤس فقط رنگ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء
ناز قادری، اردو ناول کا سفر، مکتبہ صدف، دہلی، ۲۰۰۱ء
نکہت حسن، جاگنگ پارک، شہزاد پبلشرز، کراچی، ۲۰۱۰ء
وحید احمد، مندری والا، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۲
یوسف سرمست، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اردو ناول، نیشنل فائین پرنٹنگ، حیدرآباد، ۱۹۷۳ء

رسائل و جرائد

بک ڈائجسٹ (ماہنامہ)، لاہور، شمارہ: ۳۔۴، ۲۰۲۰ء
ادبیات (خصوصی شمارہ: اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ)، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۲۰ء

لغات

شان الحق حقی (مرتبہ)، فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۲۰۰۸ء، ص ۶۴۸
جمیل جالبی، ڈاکٹر، (مؤلف) قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء

انٹرویو

حفیظ خان (انٹرویو) از عقیل حیدر، اسلام آباد، ۲۱ ستمبر ۲۰۲۰ء، بوقت بارہ بجے دن

راقمہ: استفسار از جاوید اختر بھٹی، بذریعی موبائل فون، ۲۵ مئی ۲۰۲۲ء، بوقت شام ۵ بجے